رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

جلد ۲ عدد ۵

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

تفسیر احسن التفاسیر

مصنفہ مولانا سید احمد حسن محدث دہلوی مصنف تنقیح الرواۃ شرح مشکوٰۃ وغیرہ

اردو میں گو تفاسیر بہت ہیں - لیکن اس تفسیر پاک کی حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کے علاوہ بعض یہ خصوصیات ہیں -

(۱) محدثین کی مسلمہ تفسیروں کا بہترین نچوڑ ہے - (۲) آیات کے شان نزول منقح کرکے بسط سے بیان کئے گئے ہیں - (۳) عقاید ، عبادات اور روزمرہ کے معاملات زندگی میں قرآن مجید کے احکام و مسائل کی تفصیل ، احادیث و آثار کی روشنی میں کی گئی ہے - اس لحاظ سے گویا اس تفسیر کو احکام القرآن کی حیثیت بھی حاصل ہے - (۴) ابتداء میں ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے جو اصول تفسیر کے نفیس مباحث پر مشتمل ہے - یہ مقدمہ ۹۰ بڑے صفحات پر پھیلا ہوا ہے -

ایک عرصہ سے یہ تفسیر نایاب تھی اب یہ مزید اہم خصوصیات اور نہایت آب و تاب کے ساتھ دوبارہ شائع ہوگئی ہے -

موجودہ اشاعت کی چند خصوصیات

(۱) شان نزول اور آیات کی تفسیر میں فاضل مؤلف جسقدر مرفوع احادیث لائے ہیں انکی تخریج مع قید صفحات کتب کر دی گئی ہے - جسکی وجہ سے اسکی استنادی حیثیت پہلے سے بھی بلند ہوگئی ہے -

(۲) تخریج کے علاوہ بعض خاص مواقع پر مفید حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جو گو مختصر ہیں لیکن جامع ہیں -

(۳) طباعت کا سابقہ انداز بدل دیا گیا ہے اوپر قرآن مجید مترجم بین السطور اور اسکے ساتھ ساتھ آیات کے نمبر دے کر نیچے تفسیر دی گئی ہے -

(۴) سابق طبع کی سہوی یا مطبعی اغلاط کی اصل کتب سے مراجعت کرکے تصحیح کر دی گئی ہے جلد اول تیار ہے جو مقدمہ اور منزل اول پر مشتمل ہے - بڑا سائز چار سو سے زائد صفحات - کتابت و طباعت دیدہ زیب جلد عمدہ جاذب نظر - قیمت صرف ۱۰/۰

دوسری جلد کی تیاری شروع کر دی گئی ہے لیکن اسکی جلد طباعت زیادہ تر جلد ہذا کی خریداری پر منحصر ہے -

المکتبۃ الرحمانیہ اچھرہ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ
مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

★

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ جنوری ۱۹۶۰ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ | عدد ۱

تذکرہ و تبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن
تفسیر سورہ بقرہ ——— " ——— ۹

اسلامی قانون
اسلامی قانون کی تدوین ——— " ——— ۱۹

سفر حج
مشاہدات حرم ——— " ——— ۲۷

مراسلہ و مذاکرہ
حکومتی اقتدار اور اصلاح معاشرہ۔ اسلام میں شوریٰ کی حیثیت۔ غیر اسلامی حکومتوں کے متعلق کے لیے رہنما اصول۔ ماعز اسلمی۔ ۳۶

تاریخ و سیر
عہد صحابہ کے سب سے کمسن مفسر ——— ۴۸

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

"میثاق" کے دسمبر کے شمارہ میں ہم نے ایک دردمند مسلمان کی ایک چٹھی شائع کی ہے۔ اس چٹھی میں صاحبِ مکتوب نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کا بھی حوالہ دیا ہے جو علامہؒ نے جامع ازہر کے اس وقت کے شیخ، علامہ مصطفیٰ مراغی کو لکھا تھا۔ صاحبِ مکتوب کے بیان سے یہ واضح تھا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں اپنے اس تخیل کا اظہار فرمایا ہے جو وہ مسلمانوں کی فکری و اخلاقی اصلاح سے متعلق اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ اس خط کی اس اہمیت کے سبب سے ہماری خواہش تھی کہ اس کے مضمون سے ہم خود بھی واقف ہوں اور "میثاق" کے قارئین کو بھی واقف کریں۔ اب یہ ایک بالکل تائیدِ غیبی ہے کہ ہمارے مخدوم جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے جوہر آباد سے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس خط کی نقل ہمارے پاس بھیج دی ہے۔ یہ خط ایک اہم دستاویز ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو اس ضرورت کا احساس کتنی شدت کے ساتھ تھا جس کی طرف ہم نے "میثاق" کی گذشتہ اشاعت میں توجہ دلائی ہے۔ علامہ مرحوم کا اصل خط تو عربی میں ہوگا۔ محترم چودھری صاحب نے اس کا اردو ترجمہ ہمیں ارسال فرمایا ہے، اس کا ضروری حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ علامہ مرحوم شیخ مراغی کو لکھتے ہیں:۔

● "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وتورع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم ان کے لیے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں، جو کہ ان کے لیے ایک علمی اسلامی مرکز ہو۔ اور ہم ان کے لیے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں بصارتِ تامہ رکھتا ہو، نیز انقلاب دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرے۔ اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے، تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعہ تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جہاد کر سکیں۔ اس تجویز کو منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہِ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں۔ تاکہ یہ شخص ہم کو اس کام میں مدد دے۔ چاہیے کہ یہ شخص علوم شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو۔ نیز زبان انگریزی پر بھی قدرت کامل رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں مجھے مصری وفد کے اراکین سے جنہوں نے پچھلے دنوں ہمیں اپنی زیارت سے مشرف فرمایا تھا؛ معلوم ہوا تھا کہ جامعہ ازہر اپنے خرچ پر ہندوستان میں چند مبلغین مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے، مقصد تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ

واقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف واکناف میں پھیلے گا۔"

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس خط کی اشاعت سے ہمارا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ہم نے اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے جس قسم کے اشخاص و رجال کی ضرورت کی طرف میثاق کے پچھلے شمارے کے "تذکرہ و تبصرہ" میں توجہ دلائی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنی بصیرت سے اس کی ضرورت بہت پہلے محسوس فرمائی تھی۔ جہاں تک اصل مدعا کا تعلق ہے وہ انھوں نے ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اب اگر کہا جا سکتا ہے تو اس مدعا کی وضاحت میں نہیں بلکہ اس کے ان تقاضوں کی تفصیل میں کہا جا سکتا ہے جو نئے حالات سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور آئندہ مزید آئیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ تقاضے گوناگوں ہیں اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ تمام تقاضے اور مطالبے اگر علامہ مرحوم کے سامنے بھی ہوتے تو ان کے حساس دل سے ہم یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ سارے کام چھوڑ کر صرف اسی کام کے لیے اپنی بقیہ زندگی وقف کر دیتے۔

علامہ اقبالؒ کو اس ضرورت کا جس شدت کے ساتھ احساس تھا اس کا اندازہ ان کے ایک اور مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اسی زمانہ میں محترم جناب چودھری نیاز علی خان صاحب کو اس ادارہ سے متعلق لکھا ہے جو چودھری صاحب موصوف نے پٹھان کوٹ میں دارالاسلام کے نام سے قائم کیا تھا۔ محترم چودھری صاحب نے اس خط کی نقل بھی ازراہِ عنایت ہمیں بھیج دی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم جناب چودھری نیاز علی خان صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ ضرور تشریف لائیے۔ میں آپ کے ادارہ؎ کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ انشاء اللہ آپ کا ادارہ باحسن وجوہ اس مقصد کو پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔

؎ اشارہ ہے ادارہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کی طرف

صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔"

اس خط کے لفظ لفظ سے شدت احساس کا جو سوز نمایاں ہو رہا ہے ہر درد مند دل رکھنے والا آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس خط پر ۲۰؍جولائی ۳۷ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور اب ۶۰ء ہے۔ غور کیجیے کہ ان ۲۳-۲۴ سالوں کے اندر اندر ہمارے گرد و پیش کی دنیا کتنی تبدیل ہو گئی ہے اور علامہ اقبالؒ نے اسلام کے لیے جس نازک وقت کا حوالہ دیا ہے اس کی نزاکت اب کتنی بڑھ گئی ہے؟ علامہ نے علما، صوفیا، اخبار نویسوں اور لیڈروں کی حالت پر ماتم کیا ہے، سوچیے کہ اس مدت میں اس قابل ماتم حالت کی اصلاح ہوئی ہے یا یہ حالت اور زیادہ بگڑی ہے؟ ہماری قوم کے جمہور کا اخلاق اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ اونچا ہوا ہے یا اور زیادہ گر گیا ہے؟ الحاد و بے دینی کا طوفان روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے یا کچھ دھیما ہو رہا ہے؟ آزادی و بے قیدی کی رو اس دور کے مقابل میں طاقتور ہوئی ہے یا کمزور پڑی ہے۔ پھر اس امر پر بھی غور کیجیے کہ الحاد و دہریت اور بے قیدی و آزادی کے ان طوفانوں کے مقابل میں اسلام کی حمایت میں مورچے لگانے والے سپاہی اس وقت زیادہ تھے جب علامہؒ نے اس نزاکت حالات کا احساس فرمایا ہے یا اب زیادہ ہیں جب کہ اس پر ایک ربع صدی کی مدت گذر چکی ہے؟ اُس وقت کی صورت حال اور اس وقت کی صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے دوسرے دلایل و شواہد سے قطع نظر غالباً یہی بات کافی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں علامہؒ نے جس دارالاسلام کا تخیل ظاہر فرمایا تھا اس کا ابتدائی خاکہ بھی جو ایک دردمند مسلمان کی کوششوں سے پٹھان کوٹ میں قائم ہو سکا تھا، انقلاب زمانہ کے ہاتھوں مٹ مٹا گیا؎۔

؎ ہمارے مخدوم جناب چودھری نیاز علی خان صاحب اپنی اس جوانہمتی پر مستحق مبارکباد ہیں کہ وہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کے بکھرے ہوئے تنکے اب جوہر آباد میں ایک نئے آشیانہ کی تعمیر کے لیے فراہم کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک گرامی نامہ میں اس عاجز کو لکھتے ہیں:- (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہر شخص جو حالات پر گہری نظر رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ دین کے علم اور دین پر عمل کے لحاظ سے ہمارا حال اس وقت آج سے کہیں بہتر تھا جس وقت کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خط میں نازک قرار دیا ہے۔ اس زمانہ میں مخالف اسلام فلسفوں اور مخالف دین تحریکات کی وہ یورش بالکل ہی نہیں تھی جو اب ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن اور اسلام کے تصادم سے اس وقت تک جو سوالات ابھرے تھے وہ محض معمولی اور سطحی تھے اور اس زمانہ میں مسلمانوں میں ایسے اہل دین موجود تھے جو بحسن و خوبی ان سوالات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ اس وقت تک الحاد و دہریت کی طرف مائل ہونے والا اکا دکا کوئی ہوتا تھا اور وہ بھی معاشرے کے دباؤ سے اسلام کے خلاف زبان درازی کی جرأت تو بہرحال نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر اس وقت تک اسلامی علوم کے زندہ رکھنے کے لیے ایک غیرت و حمیت پائی جاتی تھی اور اس غیرت و حمیت کے اثر سے اس مقصد کے لیے ایثار کرنے والے اور قربانیاں دینے والے ہمارے ہر طبقہ میں مل جاتے تھے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے ساتھ ایک قسم کی حریفانہ چشمک بھی موجود تھی جو مسلمانوں کو دینی عقاید اور اسلامی اقدار کے احترام اور ان کے تحفظ و بقا کے وسایل و ذرائع اختیار کرنے پر ابھارتی رہتی تھی۔ ملک کے ہر حصہ میں قابل ذکر دینی ادارے موجود تھے جن کی رہنمائی آج کی نسبت سے بہتر انجام دے رہے تھے اور مسلمان ریاستوں کی سرپرستی کی بدولت ان کے مالی حالات بھی آج کے مقابل میں بدرجہا قابل اطمینان تھے۔

آج کے حالات کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ آج ہر چیز بدل چکی ہے۔ آج الحاد و لادینی نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی پشت پر اس کی تائید و حمایت کے لیے مرتب و مدون فلسفے وجود میں آ چکے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور اسلام کے تصادم سے جو سوالات آج اٹھ رہے ہیں وہ سرسری اور سطحی قسم کے نہیں ہیں بلکہ نہایت گہرے، عمیق اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اس طرح کے مسایل سے جو لوگ عہدہ برآ ہو سکتے تھے وہ یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جا رہے ہیں، جو باقی ہیں معلوم نہیں وہ کتنے دنوں کے مہمان ہیں اور نہایت غم و اندوہ کی بات یہ ہے کہ نہ ان کی جگہیں لینے والے ہمارے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور نہ ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کا ہمارے پاس اس وقت کوئی انتظام ہی ہے۔ دینی تعلیم و تربیت اور اسلامی علوم کی خدمت کے جو قابل ذکر ادارے موجود تھے وہ تقسیم ملک نے بھارت کے حصے میں ڈال دیے اور ان کی کس مپرسی جو پہلے بھی کچھ کم نہیں تھی، اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس حد تک پہنچی ہے اور آیندہ کس حد تک پہنچے گی۔ پاکستان اس قسم کے اداروں سے پہلے بھی تقریباً خالی ہی تھا لیکن اگر کچھ ادارے تھے بھی یا قائم بھی ہوئے تو نئے حالات اور جدید رجحانات نے نہ ان کو ابھرنے کا موقع دیا اور نہ توقع ہے کہ ان کو ابھرنے کا موقع ملے گا۔

یہ صورت حال ہر اس شخص کے لیے انتہائی حد تک تشویش ناک ہے جو اپنے سینہ میں اسلام کا کچھ درد اور اس قوم کی آیندہ نسلوں سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس رکھتا ہے۔ ایسے تمام اشخاص کو ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات یاد دلانا چاہتے ہیں کہ علم دین کے اس دنیا سے اٹھ جانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ علم اٹھا لیا جائے گا بلکہ اس کی شکل یہ ہوگی کہ دین کے علم رکھنے والے اٹھ جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ان لوگوں کو اپنا لیڈر بنانے پر مجبور ہوں گے جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ آج قرآن مجید موجود ہے اور خدا کا وعدہ ہے کہ یہ قیامت تک موجود رہے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی موجود ہے اور جہاں تک کتابوں کے اندر موجود رہنے کا تعلق ہے، انشاء اللہ یہ چیز بھی قیامت تک موجود رہے گی۔ اسلامی قانون موجود ہے اور کتب خانوں کی الماریوں سے اس کے غائب ہو جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن دین اور علم دین کے قائم و باقی رہنے کے لیے صرف ان چیزوں کا باقی رہنا کافی نہیں ہے بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ ان کے ایسے حاملین باقی رہیں جو اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے لحاظ سے دنیا پر ان کی حجت قائم کر سکیں، جو تمام باطل فلسفوں کا

(بقیہ حاشیہ) ● "میں نے ایک عریضہ میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ میں دارالاسلام کی دوبارہ تاسیس کا انتظام کر چکا ہوں کیونکہ میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ (علامہ اقبالؒ) کی امانت اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ تعمیر کے لیے مصالحہ فراہم کر رہا ہوں، اس کے لیے علامہؒ کی پہلی تجویز یعنی لائبریری کے فراہم کرنے کی فکر دوں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوگا وہ اس کا سامان فرما دے گا..... اگر پسند خاطر ہو تو کسی وقت چند احباب کے ساتھ تشریف لا کر میری باتیں بھی سن لیں اور موقع بھی دیکھ لیں۔ ایسے مرکز کے لیے موقع کی خصوصیت بھی بڑی بات ہوتی ہے" ●

علیٰ وجہ البصیرت ابطال کر سکیں، جو تمام غلط تحریکات کی غلطیاں لوگوں کے سامنے بے نقاب کر سکیں اور جو ہر دور میں دنیا پر یہ حقیقت واضح کر سکیں کہ زندگی، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کے کامیابی کے ساتھ گذارنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہی ہے جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے۔

غور کیجیے کہ اس قسم کے حاملین دین ہمارے اندر موجود ہیں؟ اگر ہیں تو وہ کتنی تعداد میں ہیں اور ان کے بعد ان کی جگہیں لینے والے اشخاص کے پیدا کرنے کا ہمارے پاس کیا انتظام ہے؟ اس وقت جو دینی مدارس موجود ہیں ہم ان کی تنقیص نہیں کرتے، انھوں نے نہایت حقیر اسباب و وسایل اور نہایت معمولی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جو خدمت دین کی انجام دی ہے یا انجام دے رہے ہیں ہماری نگاہوں میں اس کی بڑی عزت ہے، اس وقت دین کا جو چرچا بھی موجود ہے، یہ انہی مدارس کی برکت ہے لیکن اس دور میں دین کی خدمت کے لیے جن قابلیتوں اور جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ان کے پیدا کرنے کے اسباب و وسایل نہ ان مدارس کے پاس موجود ہیں اور نہ اس بات کی توقع ہے کہ وہ یہ اسباب و وسایل فراہم کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں ایک اور مشکل بھی ان مدارس کی راہ میں حایل ہے۔ وہ یہ کہ جس مقصد کی طرف ہم توجہ دلا رہے ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ عربی مدارس کا پورا نظام تعلیم تبدیل ہو لیکن اس قسم کی بنیادی تبدیلی کے لیے ان مدارس کا آمادہ ہونا بہت بعید از قیاس نظر آتا ہے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ یہ جب تک قایم رہ سکیں گے اپنی انہی خصوصیات کے ساتھ قایم رہیں گے جو خصوصیات آج ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔

ایسے حالات کے اندر سوچیے کہ دین کے تحفظ کے لیے کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے؟ اس کی سب سے بہتر شکل تو یہ تھی کہ اس ملک کے تعلیمی نظام ہی میں ایسی تبدیلی ہو جاتی کہ اسی نظام سے دین اور دنیا دونوں کے خدمت گذار پیدا ہوتے۔ ہمارے نزدیک نظر بظاہر یہ چیز بعید تو ضرور ہے لیکن محال ہرگز نہیں ہے۔ اس وقت اس ملک کی باگ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ کھلے دل کے لوگ ہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی جامع اسکیم آئے تو وہ اس پر کم از کم غور تو کھلے دل سے کریں گے اور اگر اس کی افادیت و اہمیت ان پر واضح ہو جائے تو وہ اس کو بے تکلف اختیار اور بلا تاخیر نافذ بھی

(باقی برصفحہ ۴۶)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۶)

ایک شبہ کا ازالہ

ان آیات میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخالفوں کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، ممکن ہے ان کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ انداز کلام اس حکمتِ دعوت کے منافی ہے جس کی نصیحت خود قرآن نے فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے خود یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور اہل کتاب کے بارے میں تو خاص طور پر اس کی یہ ہدایت ہے کہ ان سے صرف خوبصورت طریقہ ہی سے دین کے معاملہ میں بحث و گفتگو کی جائے۔ پھر یہاں قرآن نے انہی اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں سفہا اور مفسدین اور ان کے اکابر اور لیڈروں کے لیے شیاطین تک کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ دعوت کے دور میں استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ اس وقت استعمال ہوئے ہیں جب انھوں نے اپنی مسلسل ہٹ دھرمیوں اور شرارتوں اور اسلام کے خلاف اپنی پیہم ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور یہ کسی طرح بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس مرحلہ میں اگر ان لوگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور مقصود ان کے استعمال سے صرف غصہ اور نفرت کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ

بیانِ واقعہ اور اظہارِ حقیقت ہے۔ تاکہ دوسرے دوسرے لوگ جو اپنے دین و ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں ان لوگوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ آسمانی ہدایت کے ان قدیم وارثوں کا انحطاط اب کس درجہ تک پہنچ چکا ہے اور جن کو خدا نے اپنی زمین کی اصلاح کے کام پر مامور کیا تھا اب وہ اس میں کیا فساد مچا رہے ہیں۔

یہ سورہ بقرہ، جس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، بنی اسرائیل کے لیے دعوت کی سورہ نہیں بلکہ ان کے لیے ملامت کی سورہ ہے۔ اس میں ان کے ان جرائم کی فہرست پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو انھوں نے خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے خلاف کیے ہیں اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کا مستحق قرار دیا ہے کہ وہ قوموں کی امامت کے منصب سے ہٹائے جائیں اور ان کی جگہ ایک دوسری امت اس منصب پر سرفراز کی جائے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اچھی طرح اتمامِ حجت کر چکنے کے بعد فرمایا ہے اور اس کے وجوہ اور دلائل آگے اس سورہ میں بیان ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ بات عین اس سورہ کے مزاج کے مطابق ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھا دی جائے تاکہ جن لوگوں پر ان کے مذہبی تقدس کا ایک رعب تھا اور جس سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پراپگنڈا کرنے میں فائدہ اٹھا رہے تھے وہ ختم ہو جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہود کے علما اور لیڈروں کے لیے جو سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ بھی اسی طرح کے اتمامِ حجت کے بعد استعمال فرمائے ہیں۔ حضرت مسیح کے یہ الفاظ انجیلوں میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کے الفاظ سے ان کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے الفاظ بہت ہی نرم ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو ان کے لیے "سانپ کے بچوں" اور "سفیدی پھری ہوئی قبروں تک" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

۱۶ - آگے کا سلسلہ کلام

اس کے بعد قرآن نے مذکورہ دونوں مخالفِ اسلام گروہوں کی الگ الگ تمثیل بیان کی ہے۔ پہلی تمثیل مقدم الذکر مختوم القلوب گروہ کی ہے جو اپنی فطرت کو اس قدر مسخ کر چکا ہے اور اسلام کی مخالفت میں اس قدر آگے جا چکا ہے کہ اب اس کے لیے اسلام قبول کرنے کا کوئی امکان ہی باقی

نہیں رہا ہے۔

دوسری تمثیل اس موخر الذکر گروہ کی ہے جو اسلام کی علانیہ مخالفت کے بجائے اس کے خلاف چالیں چل رہا ہے اور ایک نہایت واضح حقیقت کا، جس کا حق ہونا خود اس پر بھی واضح ہے، نہایت اوچھی تدبیروں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

پہلے ان دونوں تمثیلوں کو، قرآن کے حکیمانہ الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے، اس کے بعد ہم اپنے الفاظ میں ان کی وضاحت کریں گے۔ فرمایا:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ
ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ (١٧)
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (١٨) أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ
فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (١٩)
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ
وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ
أَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٢٠)

ترجمہ: ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔

یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی ہو، کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ کڑکے کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لے رہے

ہوں، حالانکہ اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی ہو، جب جب چمک جاتی ہو یہ چل پڑتے ہوں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہو رک جاتے ہوں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

---

۱۷ - بعض الفاظ کی تحقیق

صَیِّب کا لفظ سخت بارش کے لیے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کے لیے بھی۔ ہم نے اپنے ترجمہ میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تمثیل میں جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اس لفظ سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے اور قرآن کو خود قرآن میں بارش سے جگہ جگہ تشبیہ دی گئی ہے۔

سماء کا لفظ عام طور پر تو اس سقفِ نیلگوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کو ہم آسمان کہتے ہیں اس کے علاوہ یہ ابر کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس فضائے بسیط و عریض کے لیے بھی جو ہمارے سروں پر ہے۔

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ سماء کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اضافہ سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس تصویر کی کسی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ دوسرے اس سے قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو جاتا ہے کیونکہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔

صواعق، صاعقہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

۱۸ - دونوں تمثیلوں کی وضاحت

ان دونوں تمثیلوں کی وضاحت سے پہلے نفس تمثیل سے متعلق ایک اصولی حقیقت کا

ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

وہ یہ کہ تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے اور ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے۔ لیکن تمثیل میں اجزاء کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں صورت واقعہ کو صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر ایک صورت حال اور دوسری صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورت حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے، اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہل فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب پہلی تمثیل کو لیجیے۔

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی تمثیل ہے جس نے اندھیری رات میں لوگوں کو روشنی دکھانے کے لیے آگ جلائی۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور بڑے اہتمام کے ساتھ کیا یہاں تک کہ اس کا تمام گردوپیش منور ہو گیا۔ لیکن جن لوگوں کے لیے اس نے یہ محنت برداشت کی انھوں نے اس روشنی کی کوئی قدر نہیں کی۔ ان کی اس ناقدری کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر چھوڑ دیا جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ پھر اس اندھیرے کے اوپر مزید غضب یہ ہے کہ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے بھی ہیں اور یہ تمام اوصاف ان کے اندر بیک وقت موجود ہیں[1]۔ اس وجہ سے نہ تو یہ کسی پکارنے والے کی پکار سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ کسی نشان یا علامت یا اشارہ سے کوئی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ جس راہ پر وہ چل پڑے ہیں

---

[1] صم بکم عمی سے متعلق استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ افادہ یہاں قابل ذکر ہے کہ اگر صفات کا بیان بغیر حرف عطف کے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام صفات موصوف کے اندر بیک وقت موجود ہیں۔

اس سے مڑ کر کسی اور راہ کو اختیار کر سکیں۔

غور کیجیے تو یہ تمثیل ٹھیک ٹھیک یہود کے اس گروہ پر منطبق ہو رہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اس وجہ سے اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تمثیل میں آگ جلانے والے شخص سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کے لیے ہدایت کی شمع جلائی اور اس شمع نے پوری قوم کے لیے اجالا بھی کر دیا لیکن زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ بنی اسرائیل کی اکثریت اس روشنی سے بیزار ہو گئی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور وہ ہدایت کی باتیں سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت سے بالکل ہی محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی اس محرومی و بدبختی کی تفصیلات تورات و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہیں اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مختلف مقامات میں آیا ہے۔ یہاں ان کی اسی حالت کو تمثیل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل ایک قافلہ کی ہے جس کے تمام افراد بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، مزید براں رات اندھیری ہے اور اس اندھیری رات میں یہ قافلہ بھٹک رہا ہے، نہ یہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی کو پکار سکتا ہے نہ کسی کا جواب دے سکتا ہے اور نہ کسی نشان یا روشنی سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری تمثیل ایک ایسے قافلہ کی ہے جو رات کی تاریکی میں بارش میں گھر گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، بارش زوروں کی ہو رہی ہے، بارش کے ساتھ کڑک اور چمک بھی ہے۔ قافلہ والوں کا حال یہ ہے کہ جب کڑکا ہوتا ہے مارے خوف کے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ جب بجلی کوندتی ہے تو اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں۔ جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ تمثیل یہود کے اس دوسرے گروہ کی تصویر ہے جس کا ذکر وَمِنَ النَّاسِ الآیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ ظلمات سے اشارہ ان مشکلات راہ

کی طرف ہے جن سے قرآن کی دعوت قبول کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رعد و برق سے مراد قرآن کی وہ دھمکیاں اور وعیدیں ہیں جو قرآن اپنے جھٹلانے والوں کو سنا رہا تھا اور جن کی زد خاص طور پر یہود پر پڑ رہی تھی۔ اس گروہ کو چونکہ قرآن کے حق ہونے کا پورا پورا احساس تھا اس وجہ سے یہ دھمکیاں اور وعیدیں ان کو بڑی شاق گذرتی تھیں۔ ان کا صحیح علاج یہ تھا کہ یہ قرآن کی دعوت قبول کر لیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس اس کا علاج یہ سوچا کہ قرآن کی بات سرے سے سنیں ہی نہیں۔ اس صورت حال کو تمثیل اس طرح مصور کر رہی ہے کہ "یہ لوگ موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر ایک احمقانہ تدبیر ہے۔ اگر بجلی گرا چاہتی ہے تو اس سے بچاؤ کی یہ تدبیر کیا کارگر ہو سکتی ہے کہ آپ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں؟ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص شیر کو دیکھے کہ وہ اس پر حملہ کیا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر لے کہ اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ شیر حملہ کرنے سے باز آ جائے۔ البتہ یہ ہوگا کہ اس کو شیر کا حملہ نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح قرآن مجید کی وعیدوں اور دھمکیوں کا یہ علاج کہ وہ سنی نہ جائیں ایک احمقانہ علاج ہے۔ اس سے ان کی واقعیت میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا البتہ اگر ہوگا تو یہ ہوگا کہ یہ اس وقت واقع ہوں گی جب آدمی ان سے بالکل غافل ہوگا۔ شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جب طوفان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے۔ کسی حقیقت سے فرار کے لیے یہود کے اس گروہ کی یہ پالیسی بھی شتر مرغ کی اس پالیسی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"جب بجلی چمکتی ہے تو چند قدم چلتے ہیں جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ یہ ان کی اس حیرانی و پریشانی کی تصویر ہے جس میں قرآن مجید کے نزول کے بعد وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قرآن کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اس کی چمک اور دمک نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تھی اور اس کی برق خاطف سے ان کے لیے بچنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ حیران و درماندہ تھے کہ کیا کریں۔ اس حیرانی و درماندگی کی حالت میں اگر کوئی بات بنتی نظر آتی تھی تو بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن کسی حقیقت کا مقابلہ محض سخن سازی سے زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے اس وجہ سے جب بنائی ہوئی بات بگڑ جاتی تو پھر حیران و درماندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے۔ چنانچہ اوپر ذکر ہوا ہے

کہ یہ مسلمانوں کو چکمہ دینے کے لیے یہ کہتے تھے کہ تم خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہو تو خدا اور آخرت پر تو ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اس پر یہ گرفت ہوجاتی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے تو پھر مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے اور ان کو گالیاں دینے لگتے۔

۱۹ - دونوں گروہوں میں فرق

اس تفصیل سے یہ حقیقت تو واضح ہوگئی کہ مذکورہ دونوں تمثیلیں یہود ہی کے دو گروہوں کی ہیں لیکن اس بات کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ ان دونوں گروہوں میں فرق و اختلاف کی نوعیت کیا ہے؟ عام طور پر تو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک گروہ کفر منکرین کا ہے اور دوسرا گروہ منافقین کا۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے وہ تو بلاشبہ قرآن اور اسلام کے جامد مخالفین ہی کا ہے لیکن دوسرے گروہ کے متعلق ہم اوپر یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ اس کو عام معنی میں منافقین کا گروہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ منافقین جہاں تک کم از کم ظاہر کا تعلق ہے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ نہیں رکھتے تھے لیکن ان لوگوں کا جو حال اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار نہ تو عملاً کرتے تھے اور نہ قولاً کرنے کے لیے تیار تھے۔ حد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو علانیہ بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ ہیں تو یہود ہی کے اور دونوں اسلام اور قرآن کے مخالف بھی ہیں لیکن دونوں کی مخالفت کے مزاج الگ الگ ہیں۔ پہلے گروہ کی مخالفت کا مزاج جمود، اور ہٹ دھرمی ہے۔ یہ اندھوں اور بہروں کی طرح انکار پر جم گیا ہے اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دوسرے کی مخالفت کا مزاج حاسدانہ لیکن ساتھ ہی بزعم خود مصلحت اندیشانہ بھی ہے۔ یہ ان تمام خطرات کو بھانپ رہا ہے جو اسلام کے

ظہور سے یہودیت اور نصرانیت سب کے لیے پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ان خطرات کا سدباب کرے۔ اس مقصد کے لیے جو تدبیر اس کی سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقہ پر قائم رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی جاسکے ان کی ہم آہنگی کی جائے اور ساتھ ہی ان سے بھی یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اپنی انفرادیت سے دستبردار ہو کر دین داری اور خدا پرستی کا کوئی مقام ان کے لیے بھی تسلیم کرنے پر راضی ہوجائیں۔ لیکن قرآن نے اس بات کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کردیا ہے کہ دین حق اس قسم کی سودا بازی کے لیے نہیں آیا ہے، جس کو ایمان لانا ہو وہ سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح ایمان لائے ورنہ جو راہ اس کو پسند ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے نتائج بھگتے۔

اگرچہ پہلے گروہ کی ہٹ دھرمی اور ضد کی طرح اس دوسرے گروہ کی یہ چالبازی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے لیکن اس گروہ کا یہ احساس کہ قرآن کا مقابلہ ہٹ دھرمی اور ضد سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لیے ہوشیاری اور مصلحت بینی کی ضرورت ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے گروہ کی طرح قبولیت حق کی صلاحیت اس کے اندر بالکل مردہ نہیں ہوچکی ہے بلکہ اس کے اندر اس صلاحیت کی کچھ نہ کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس نے بھی اس صلاحیت سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ حق سے فرار کی انہی تدبیروں میں مشغول رہا جن میں اس وقت مشغول ہے تو سنت الٰہی کے مطابق اس کی یہ رہی سہی صلاحیت بھی سلب ہوجائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کے یہ الفاظ اشارے کررہے ہیں ولو شاء اللہ لذھب بسمعھم وابصارھم ان اللہ علی کل شیء قدیر (اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں سلب کرلیتا لیکن وہ ہر ایک کو پوری مہلت دیتا ہے) بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۰ - آگے کا سلسلۂ کلام

ان دونوں تمثیلوں کے بعد ذرا دیر کے لیے یہود سے صرف نظر کر کے چند آیتوں میں بنی اسمٰعیل (عربوں) کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نعمت کی قدر کریں اور قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اصل سلسلۂ کلام سے ہٹ کر اس دعوت کی ضرورت اس

وجہ سے پیش آئی کہ یہود کی اس مخالفت کا اصل محرک وہ حسد تھا جو وہ بنی اسمٰعیل سے اس بنا پر پہلے سے رکھتے تھے کہ ان کے صحیفوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ آخری نبی امیوں (بنی اسمٰعیل) کے اندر پیدا ہوں گے۔ اس پیشین گوئی نے قرآن کے نزول اور اسلام کے ظہور سے جب ایک واقعہ کی شکل اختیار کر لی اور یہود پر اس کی صداقت کے آثار ظاہر ہو گئے تو ان کا یہ حسد جو اب تک چھپا ہوا تھا بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا۔ انھوں نے یہ ٹھان لی کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اس دعوت کو ناکام بنائیں گے اور دینی پیشوائی کی جو عزت ان کو اب تک حاصل رہی ہے اس کو عربوں کی طرف منتقل نہ ہونے دیں گے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ جس طرح اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے شگوفے چھوڑا کرتے تھے اسی طرح عربوں کے اندر بھی مختلف قسم کی وسوسہ اندازیاں کرتے رہتے تھے تاکہ یہ اس نعمت سے محروم رہ جائیں جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمانی چاہی ہے اور جس کے نتیجہ میں ان کو تمام عالم کی امامت و سیادت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہود اس قسم کی سازشوں میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں اس وجہ سے سادہ لوح عرب ان کے چکموں میں آ جاتے تھے اور اسلام کے خلاف یہودیوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو بے سمجھے بوجھے خود بھی دہرانا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن نے یہاں اصل سلسلہ کلام کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ کی اس کتاب پر جس کی حجت تمہارے اوپر پوری ہو چکی ہے ایمان لاؤ، اگر تم نے محض یہود کی وسوسہ اندازیوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس نعمت عظمیٰ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو یاد رکھو کہ اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ (باقی آیندہ)

اسلامی قانون

امین احسن اصلاحی

اسلامی قانون کی تدوین

حضرات! میں اپنی آج کی تقریر میں اسلامی قانون کی تدوین کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر کچھ باتیں کہوں گا

اسلامی قانون کی موجودہ صورت آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ جس صورت میں ہمارے ملک کا ضابطۂ دیوانی اور ضابطہ فوجداری مرتب ہے اس شکل میں ہمارا اسلامی قانون مرتب و مدون نہیں ہے اس وجہ سے عدالتوں کے لیے جس طرح ضابطہ دیوانی اور ضابطہ فوجداری سے فائدہ اٹھانا آسان ہے، اس طرح اسلامی قوانین سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے۔

اسلامی قانون کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم ماخذ، آپ جان چکے ہیں، قرآن ہے۔ لیکن قرآن معروف قانونی ضابطوں کی شکل میں مرتب نہیں ہے۔ بلکہ اس میں قانون کے ساتھ عقائد، اخلاق موعظت امثال، قصص اور تاریخ ساری ہی چیزیں ملی جلی ہوئی ہیں۔ پھر قانون کا جو حصہ اس میں بیان ہوا ہے اس میں اہل تاویل کے اختلافات بھی ہیں۔ اگر کوئی عدالت قرآن کے مطابق فیصلہ کرنا چاہے تو اس کو اختلاف تاویل، اختلاف قرأت اور تعیین ناسخ و منسوخ وغیرہ کے نہایت دشوار گذار اور نہایت دیر طلب مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ موجودہ زمانہ کی کسی عدالت کے لیے ان تمام مراحل کا طے کرنا ظاہر ہے کہ نہایت مشکل ہے۔

اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ احادیث ہیں۔ اگرچہ حدیث کی کتابوں میں ایسی کتابیں موجود ہیں جن کی ترتیب فقہی اور قانونی ہے لیکن ان سے قانون اخذ کرنا قرآن مجید سے قانون اخذ کرنے سے کم مشکل

نہیں ہے۔ احادیث کی تحقیق و تنقید کا کام بڑی محنت اور بڑی قابلیت کا طالب ہے۔ تحقیق و تنقید کے بعد احادیث کے باہمی اختلافات کو رفع کرنا اور ان میں تطبیق دے کر کسی پختہ بات تک پہنچنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عدالتوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

اسلامی قانون کا تیسرا وسیع تر ماخذ اجتہاد ہے۔ اجتہاد میں سب سے پہلی مشکل تو یہ ہے کہ ہر شخص نہ تو صاحب اجتہاد ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ پچھلے مجتہدین کے اجتہادات کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ آدمی اس میں گم ہو کے رہ جاتا ہے۔ اول تو ہمارے ہاں اسلامی فقہ کے چار مستقل اسکول بن چکے ہیں جو اپنے اپنے اجتہادات اور اپنے اپنے طریق اجتہاد دونوں میں ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایک اسکول کے اندر بھی اجتہاد کے اختلافات ہیں۔ بہت سے مسائل میں ایک ہی اسکول کے متقدمین کچھ کہتے ہیں اور متاخرین کی رائے کچھ ہے۔ پھر ایک ہی اصول اجتہاد پر چلنے والے علماء و ائمہ کی رایوں اور فتووں میں بھی اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اگر قاضی ابو یوسف صاحبؒ اور امام محمد صاحبؒ کے اختلافی اقوال جمع کر دیئے جائیں تو امام ابو حنیفہ صاحبؒ کی فقہ کے مقابل میں ان کی ایک مستقل فقہ مرتب ہو جائے گی۔

میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ قانون کا مدون ہونا زیادہ بہتر ہے یا اس کا غیر مدون حالت میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی صورتوں کے اندر کچھ فوائد بھی ہیں اور کچھ نقصانات بھی ہیں۔ میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ معاذ بن جبلؓ اور قاضی شریحؒ کے سامنے اسلامی قانون مدون شکل میں موجود نہیں تھا بلکہ انھیں قرآن و حدیث سے خود وقت کے وقت احکام مستنبط کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح امریکہ اور انگلستان میں آج بھی مدون قانونی ضابطے موجود نہیں ہیں۔ یورپ میں مدون قوانین کا رواج نپولین کے زمانہ سے ہوا ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود میں اپنے ملک کے لیے یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ یہاں اسلامی قانون مدون کر دیا جائے۔ میں اس کے حق میں نہایت واضح عقلی اور نقلی دلائل بھی دے سکتا ہوں لیکن چونکہ اس کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اس مسئلہ پر کوئی بحث غیر ضروری خیال کرتا ہوں اور آگے چلتا ہوں۔

قانون اسلامی کی تدوین کی پچھلی کوششیں

یہاں مناسب ہوگا کہ میں مختصر طور پر قانون اسلامی کی تدوین کی ان کوششوں کا بھی ذکر کردوں جو ماضی میں ہو چکی ہیں اس سے اس کام کی نوعیت سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مبارک زمانوں کا تعلق ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اس عہد میں کسی مدون ضابطہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس وقت تک نہ تاویل و ترجیح کے اختلافات رونما ہوئے تھے اور نہ فقہی اقوال و مذاہب کی بحثیں ظہور میں آئی تھیں۔ جو لوگ مقدمات و نزاعات کے فیصلہ کے لیے قاضی اور جج کی حیثیت سے مقرر کیے جاتے تھے وہ براہ راست قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اگر قرآن و حدیث میں ان کو کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی تھی تو چونکہ وہ خود مجتہد ہوتے تھے اس وجہ سے وہ پیش آمدہ مسائل کے فیصلے اپنے اجتہاد سے کرتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے واقعہ کا ذکر میں اپنے کسی لکچر میں کر چکا ہوں بعینہٖ اسی طرح کا واقعہ قاضی شریح کا ہے جن کو حضرت عمرؓ نے مقرر فرمایا تھا۔ یہ دو بزرگوں کے نام میں نے محض مثال کے طور پر لیے ہیں۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ بھی قاضی یا مفتی کی حیثیت سے مقرر ہوتے تھے وہ بلا استثنا مجتہد ہوتے تھے اور تمام نئی صورتوں میں وہ اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو کسی مدون ضابطے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب بہت سے مجتہدوں کے اجتہادات وجود میں آ گئے، مفتیوں اور قاضیوں کے فتووں اور فیصلوں کی کثرت ہو گئی، اور اس کثرت کے سبب سے نہ تو عدالتوں کا کام اتنا سہل رہ گیا جتنا سہل پہلے تھا اور نہ اس بات کا امکان باقی رہ گیا کہ ان کے فیصلوں میں ہم آہنگی باقی رہ سکے تو عوام میں بھی قانون کی تدوین کی ضرورت کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا اور خود حکومت نے بھی اس کی ضرورت کا احساس کیا۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے۔ سب سے پہلے عربی زبان کے مشہور ادیب ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس نے اپنے عہد کے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے سامنے اسلامی قانون کی تدوین سے متعلق ایک تجویز رکھی۔ میں اس کی تجویز کا ضروری حصہ خود اس کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس نے ابو جعفر منصور کو توجہ دلائی کہ:-

"اور ان اسلامی ممالک سے متعلق امیر المومنین کو جس مسئلہ پر خاص طور پر غور کرنا ہے۔ وہ یہ فقہی اختلافات کا مسئلہ ہے جو اب اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اور مسئلہ کا حل اگر امیر المومنین پسند فرمائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ امیر المومنین ایک حکم جاری فرمائیں کہ تمام احکام

اور فیصلے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرکے امیر المومنین کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اور ساتھ ہی ہر گروہ اپنے اپنے نقلی و عقلی دلائل بھی جو وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اپنے پاس رکھتا ہے، پیش کردے۔ پھر امیر المومنین اس پورے ذخیرہ پر نظر ڈال کر ہر معاملہ میں اپنی رائے ظاہر فرما دیں اور عدالتوں کو اس کے خلاف فیصلے کرنے سے روک دیں۔ اس طرح وہ منتشر احکام اور فیصلے، جو رطب و یابس ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل ہیں، ایک مدون ضابطہ کی شکل اختیار کرلیں گے اور یہ مجموعہ غلط چیزوں سے پاک ہوگا۔ اس طرح تمام بلادِ اسلامیہ ایک ہی ضابطہ قانون کے تحت آجائیں گے اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی رائے اور فیصلہ پر تمام امت کو متفق کردے گا۔"

ابن مقفع کی یہ تجویز ابوجعفر منصور نے اس کی پیش کردہ شکل میں تو منظور نہیں کی لیکن اس کے ذہن میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوگیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سنہ ۱۴۸ھ میں جب یہ حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ خواہش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وہ تمام ممالک اسلامیہ میں ان کی فقہ پر مجتمع ہونے کے لیے حکم جاری کردے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہر گروہ کے لوگ اپنے الگ الگ اماموں اور فقیہوں پر اطمینان رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا جائے تو یہ بہتر ہوگا۔

ابوجعفر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب سے اس وقت تو خاموش ہوگیا لیکن اس کے دل میں یہ خیال برابر قائم رہا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں اسلامی قانون مدون ہوجائے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۳ھ میں جب وہ پھر حج کے لیے گیا تو اس نے اپنی یہ تجویز پوری تفصیل اور پورے زور و قوت کے ساتھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رکھی۔ اس مرتبہ تدوین قانون سے متعلق اس نے اپنا نقطہ نظر بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ:-

"اے ابوعبداللہ! (یہ امام مالک کی کنیت ہے) آپ علم فقہ کو اپنے ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کرڈالیے۔ عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعود کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو خیر الامور اوسطہا کے اصول پر مبنی ہو۔ اور جو ائمہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتووں اور

مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کردیں گے اور اپنی تمام مملکت میں اس کو جاری کرکے اعلان کردیں گے کہ کسی صورت میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔"

عام خیال یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابوجعفر منصور کی اسی خواہش کو سامنے رکھ کر موطا مرتب بھی کی لیکن وہ اس بات پر کسی طرح راضی نہ ہوئے کہ اس کو تمام مسلمانوں کے لیے حکومت کے زور سے قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی خواہش اپنے زمانہ میں ہارون الرشید نے بھی ان سے کی تھی لیکن اس کی خواہش بھی امام صاحب نے رد کردی۔

اس کے بعد اسلامی قانون کی تدوین کی ایک نمایاں کوشش گیارھویں صدی ہجری میں سلطان محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے عمل میں آئی۔ سلطان موصوف نے علماء کا ایک بورڈ بنایا اور اس کو ایک ایسی کتاب مرتب کرنے کا حکم دیا جو خود ان کے اپنے الفاظ میں "ایسے فتووں پر مشتمل ہو جن پر جید فقہا نے اتفاق کیا ہو، اور جس میں ایسے نوادر جمع کیے جائیں جن کو ماہر علما نے پسند کیا ہو۔" چنانچہ اسی حکم کے بموجب فتاوائے عالمگیری کی ترتیب عمل میں آئی۔ اگرچہ یہ کتاب اس طریقہ پر مرتب نہ ہوسکی جس طریقہ پر اس زمانہ میں قانونی ضابطے مرتب ہوتے ہیں تاہم اس سلسلہ کی یہ ایک ایسی اہم کوشش ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد تدوین قانون کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش وہ ہے جو دولت عثمانیہ کے زیر اہتمام تیرھویں صدی ہجری میں عمل میں آئی۔ حکومت نے سات جید علماء پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی اور اس کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ:

"فقہی معاملات پر مشتمل ایک ایسی کتاب تالیف کی جائے جو ضابطہ کی صورت میں مرتب ہو، جس سے فائدہ اٹھانا نہایت آسان ہو، جو اختلافات سے پاک ہو، جو تمام مختار اقوال پر حاوی ہو اور جس کی مراجعت ہر شخص کے لیے آسان ہو۔"

مذکورہ بالا مقصد سامنے رکھ کر اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا جو سنہ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں تکمیل کو پہنچا اور مجلہ احکام عدلیہ کے نام سے سلطان کے جانب سے اس کے نفاذ کا اعلان ہوا۔ جس زمانہ میں مجلہ کی تدوین ہوئی ہے اس زمانہ میں تقریباً تمام عرب ممالک میں قانون اسلامی کی

تدوین کا رجحان نہایت شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا اس وجہ سے مجلہ کو نہ صرف ٹرکی میں اختیار کیا گیا بلکہ ان تمام ممالک میں اس کو قبول کر لیا گیا جو اس زمانہ میں ترکوں کے زیر اقتدار تھے۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک یہ ان تمام ممالک میں نافذ العمل رہا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ٹرکی میں اس کو ختم کر کے اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور اٹلی کے قوانین کو دے دی گئی پھر بتدریج اس کو لبنان اور البانیہ میں بھی ختم کیا گیا۔

اس کے بعد عراق اور مصر میں قانون اسلامی کی تدوین کے لیے چھوٹی بڑی متعدد کمیٹیاں بٹھائی گئیں لیکن چونکہ ان کی خدمات کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے اس وجہ سے میں ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

ان کوششوں کی ناکامی کے اسباب

اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ یہ مختلف کوششیں جو اسلامی قانون کی تدوین کے لیے کی گئیں کوئی بااعتماد نتیجہ پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہیں۔

جہاں تک ابوجعفر منصور اور ہارون الرشید کی کوششوں کا تعلق ہے اس کی ناکامی کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کام کو اس طریقہ پر انجام دینا نہیں چاہا جو اس کا صحیح طریقہ تھا۔ اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ صاحب اجتہاد اور معتمد علما کی ایک کمیٹی بناتے اور اس کے سپرد یہ کام کرتے اور پھر اس کے مدون کیے ہوئے ضابطہ کو ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے کیا یہ کہ ساری ذمہ داری تنہا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے کندھوں پر ڈال دینی چاہی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جیسے متقی عالم تن تنہا تمام مسلمانوں کے دین کی ذمہ داری اپنے سر کیسے لے سکتے تھے اور خاص طور پر اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی لکھی ہوئی ایک کتاب ابوجعفر منصور یا ہارون الرشید کے حکم سے تمام دوسری فقہوں کو مٹا کر سرکاری فقہ اور حکومت کے ضابطہ کی حیثیت حاصل کر لے۔

دولت عثمانیہ نے جو ضابطہ تیار کرایا وہ ابتداءً تو نہ صرف ٹرکی میں بلکہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی نافذ ہوا اور ایک عرصہ تک نافذ رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ہر جگہ سے ختم ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ اب اس کے کہیں کچھ دھندلے دھندلے آثار باقی ہوں تو باقی ہوں ورنہ عملاً وہ ہر جگہ سے ختم ہو چکا ہے۔ میرے نزدیک اس کے ناکام ہونے کے بڑے سبب تین ہیں۔

نیشنلزم

اس کا پہلا سبب نیشنلزم کا وہ طوفان ہے جو پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ان تمام ممالک میں اٹھا جو اس جنگ سے متاثر ہوئے۔ اس نیشنلزم کی تحریک نے دولت عثمانیہ کو

زیر و زبر کیا اور ساتھ ہی اس قانون کا بھی خاتمہ کر ڈالا جو دولت عثمانیہ کے زیر اہتمام مدون ہوا تھا اور اسی کے واسطہ سے اس کے زیر اقتدار ملکوں میں پہنچا تھا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ خدیو اسمٰعیل پاشا نے ترکوں کے بنائے ہوئے مجلہ احکام کو محض اس بنیاد پر رد کر دیا کہ وہ مصر پر ترکوں کے اثر و اقتدار کی یادگار ہے۔ اس کا قومی تعصب اس بات پر راضی نہ ہو سکا کہ وہ ترکی اقتدار کی کوئی نشانی بھی اپنے ہاں باقی رہنے دے اگرچہ وہ اسلامی قانون ہی کیوں نہ ہو۔ اس تعصب ہی کے جوش میں اس نے شیخ مخلوف منیاوی کو مامور کیا کہ وہ نپولین کے قانون اور امام مالک کی فقہ میں تطبیق دے کر مصر کے لیے ایک نیا ضابطہ مدون کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں شیخ منیاوی نے ایک ضابطہ مدون بھی کیا لیکن مصر کے ہر حلقہ سے اس کی مخالفت ہوئی اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس مخالفت کی بنیاد بھی مخالفت کرنے والوں نے قومی تعصب ہی پر رکھی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ قانون غیر ملکی ہے، یہ اعتراض نہیں تھا کہ یہ غیر اسلامی ہے۔

سیکولرزم

دوسری چیز جس نے اس کو ناکام بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ وہ سیکولرزم کا نظریہ ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ اجتماعی اور سیاسی نظام کو مذہب سے آزاد رکھنا چاہیے۔ مغربی قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمان ملکوں کے اندر بھی اس نظریہ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور سب سے پہلے ٹرکی نے اس نظریہ کو اس کے جملہ لوازم کے ساتھ اختیار کیا۔ اسی کے نتیجہ میں ٹرکی سے مجلہ احکام عدلیہ کو ختم کیا گیا اور اس کی جگہ پر سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور اٹلی کے قوانین اپنا لیے گئے۔ جب قومیت کی بنیاد وطن پر ہو تو وہ قومیت لازمی طور پر یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس قومیت کے مختلف اجزا میں سے کسی ایک جزو کے دین کو یہ اہمیت نہیں حاصل ہونی چاہیے کہ وہ دوسروں کے دین پر فوقیت حاصل کر جائے۔ اس خرابی سے بچانے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ نظام زندگی کو مذہب سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے۔ ان قوموں کے لیے تو اس نظریہ کے اپنا لینے میں کوئی زحمت نہیں ہے جن کا مذہب ان کی زندگی کے ایک نہایت ہی محدود حصہ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس صورت میں انھیں کوئی قربانی نہیں دینی پڑتی لیکن مسلمان کے لیے، اس نظریہ کو اپنانا بڑا مہنگا پڑتا ہے کیونکہ اسلام ایک مستقل نظام زندگی ہے اس وجہ سے اس نظریہ کو اپنانے کی صورت میں مسلمان کو اپنے پورے دین سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

تقلید اور جمود

ان کوششوں کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ یہ صحیح طریقہ پر عمل میں نہیں آئی تھیں۔ ان کے عمل میں آنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ تقلید اور جمود کی بندشوں سے بالکل آزاد ہو کر یہ ضابطے کسی ایک متعین فقہ پر مبنی ہونے کے بجائے پوری فقہ اسلامی پر مبنی ہوتے لیکن ہوا یہ کہ ان ملکوں میں چونکہ فقہ حنفی کے پیرووں کی کثرت تھی اس وجہ سے ان مجموعوں کی ترتیب میں فقہ حنفی ہی کو اہمیت دی گئی، دوسری فقہوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ فقہ حنفی کی اہمیت اور اور عظمت سے انکار نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی ایک حکومت کے لیے جس قسم کا ضابطہ قوانین پوری فقہ اسلامی کی مدد سے تیار کیا جا سکتا ہے اس قسم کا مجموعہ قوانین کسی ایک فقہ کی مدد سے نہیں تیار کیا جا سکتا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ مجلہ احکام عدلیہ کے تجربے کے بعد ترکی میں بھی اور مصر میں بھی یہ رجحان بہت ترقی کر گیا تھا کہ آئندہ تدوین قانون کے کام میں کسی ایک متعین فقہ کو پیش نظر رکھنے کے بجائے پوری فقہ اسلامی کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ صحیح معنوں میں اس جامع اسلامی قانون کی تدوین ہو سکے جو زمانہ کے حالات اور تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض دوسرے عوامل کی مزاحمت کے سبب سے اس جدید رجحان کے مطابق عملاً کوئی مفید کام نہ ہو سکا۔

معاشرہ کا بگاڑ

معاشرہ کے بگاڑ نے بھی اسلامی قانون کو ناکام بنانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ قانون کی تدوین کرنے والے قانون کی تدوین میں تو منہمک رہے لیکن انھوں نے معاشرہ کے بناؤ بگاڑ سے بالکل آنکھیں بند رکھیں۔ انھوں نے اس چیز کی طرف بالکل توجہ نہیں کی کہ اگر عوام ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اتنے منفعل اور کمزور رہے کہ ہر دباؤ اور ہر پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے رہے تو ان کے لیے اسلامی قانون کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہے۔ اسلامی قانون کے استحکام کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ عوام کے اندر اس کی اتنی شدید طلب اور اس کے ساتھ ان کو اتنا مضبوط لگاؤ پیدا ہو جائے کہ اس قانون کے بغیر ان کے اندر زندگی کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہ جائے۔ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے سر قربانی دے سکیں اور اس کو باقی رکھنے کے لیے سر بازی کھیل سکیں۔ بالخصوص موجودہ زمانہ میں جب کہ اسلام اور اسلامی قانون کے خلاف نہایت وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈا جاری ہے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی ہے کہ اسلامی قانون پر ع

م عوام کے اعتقاد کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔ (باقی آئندہ)

سفر حج

امین احسن اصلاحی

مشاہداتِ حرم

منیٰ سے واپسی کے بعد ایک ہفتہ تک تو حرم میں میری حاضری بس ضابطے کی حاضری رہی۔ اتنا ازدحام ہوتا کہ حرم میں سکون سے بیٹھنے اور اطمینان سے طواف کرنے کی آرزو پوری ہونا تو درکنار فرض نمازیں ادا کرنے کے لیے بھی موزوں جگہ حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ کبھی کسی سڑک پر جانماز بچھالی کبھی کسی دروازے کی سیڑھیوں پر۔ میں نے طواف کے لیے شب کے مختلف حصوں میں پہنچنے کی کوشش کی لیکن کسی وقت بھی مطاف کا تلاطم کم نہیں پایا۔ مکہ میں مکانوں کی قلت اور ان کے گھٹے ہوئے کمروں کی گرمی کے سبب سے عام حجاج سوتے بھی زیادہ تر حرم ہی میں ہیں اس وجہ سے خاص ایام حج کے آگے پیچھے تو حرم میں سونے والوں کی بھی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ شب میں آدمی اگر جا کر نفل پڑھنا چاہے تو بڑی مشکل سے موزوں جگہ ملتی ہے۔ دو ہفتے گزرنے کے بعد اندرون ملک کے حجاج کے رخصت ہو جانے اور کچھ باہر کے حجاج کے چلے جانے کے سبب سے حرم کے اندر اتنی گنجائش پیدا ہوئی کہ صبح شام وہاں بیٹھنے کا موقع ملنے لگا۔ میں زیادہ تر اس پلاٹ میں بیٹھتا جس میں جاوا اور ملایا کے حجاج بیٹھتے۔ یہ لوگ بڑے حلیم اور بردبار ہوتے ہیں۔ حرم کے آداب کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ میں نے ان کو لڑتے جھگڑتے تو درکنار کبھی زیادہ باتیں کرتے بھی نہیں پایا۔ ان کی خواتین میں بھی زیادہ آزادی اور بے باکی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں پردہ کی پابند نہیں ہیں لیکن حرم میں چہرے کے سوا اپنے ہر حصۂ جسم کو ڈھانکے رکھنے کا بڑا اہتمام کرتی ہیں۔ طواف کے اوقات میں بھی حتی الامکان تصادم سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بیت اللہ کا جلوہ

میں اوپر یہ عرض کر چکا ہوں کہ حرم میں میری سب سے زیادہ دلچسپی بیت اللہ کے

جلوہ سے رہی۔ بیت اللہ کی محبوبیت اور دلکشی اور طواف کا منظر، یہ دو چیزیں بھولنے والی نہیں ہیں۔

بیت اللہ کی جلوہ نمائی کا طریقہ بھی خوب اختیار کیا گیا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب حجاج کے ورود کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو دروازے کی طرف سے تھوڑا تھوڑا پردہ سرکنا شروع ہوتا ہے ہر صبح کو جب آپ حرم میں داخل ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ کل کی نسبت سے آج کی شب نے چہرے کا کچھ مزید حصہ بے نقاب کر دیا ہے۔ اسی تدریج کے ساتھ یہ معاملہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ منیٰ کی روانگی کا دن آتے آتے تھوڑے سے بالائی حصہ کے سوا سارا بیت اللہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پھر جب حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں تو جلالۃ الملک اپنی نگرانی اور بیرونی سفرا کی موجودگی میں خانہ کعبہ کو غسل دلاتے اور نیا غلاف پہناتے ہیں۔ اس نئے غلاف کے لیے بھی رسم یہ ہے کہ یہ بالتدریج نہایت آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف اترتا ہے۔ آپ ہر روز صبح کو جب حرم میں داخل ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ کل جو بات تھی، آج وہ باقی نہیں رہی ہے۔ گھونگھٹ کا حلقہ کل کی نسبت آج کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

میرے دل نے ان دونوں حالتوں کا نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ میں حج سے پہلے پہلے بیت اللہ کے سامنے سراپا شوق بن کر بیٹھتا اور حج کے بعد سراپا حسرت بن کر!

حجر اسود پر میں نے تمام دوران حج میں حجر اسود پر پہنچنے کے لیے کبھی کشمکش نہیں کی۔ اگر بغیر کسی کشمکش کے پہنچنے کا موقع مل جاتا تو تقبیل کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو لیتا ورنہ آرزو مندانہ گذر جاتا۔ بالآخر جب حجاج کی بڑی تعداد رخصت ہو گئی تو بغیر کسی کشمکش کے پہنچنے کے مواقع ملنے لگے۔ یہاں تک کہ آخر میں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ طواف کے ہر پھیرے میں یہ سعادت حاصل ہو جاتی۔ بالخصوص نماز فجر سے پہلے اور صبح کے ۸ - ۹ کے درمیان جو طواف میں کرتا ان میں تو نہ رکن یمانی پر پہنچنے میں کوئی زحمت ہوتی نہ حجر اسود پر۔ یہ ساری برکتیں اس بات کا نتیجہ تھیں کہ حج کے بعد ہمیں کچھ موقع جوار حرم میں قیام کا نصیب ہو گیا۔

ملتزم پر ہجوم کم ہو جانے کے بعد ملتزم پر پہنچنے کے مواقع بھی نصیب ہونے لگے۔ ایک روز میں مقام ابراہیم کے پاس اس انتظار میں کھڑا ہوا کہ گنجائش نکلے تو ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کروں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ذرا سا موقع پیدا ہوا تو میں جھپٹ کے پہنچ گیا۔ اس وقت دھوپ تھی،

اس وجہ سے خانہ کعبہ کی دیوار تپ رہی تھی میں نے تپتی ہوئی دیوار پر اپنا چہرہ رکھ دیا اور بے تکلف میری زبان سے یہ دعا نکلی کہ اے رب تو اس گھر کی برکت سے اس چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچا۔ اس دعا میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ یہ اس وقت از خود میری زبان پر جاری ہو گئی اور اس سے میرے دل کو اطمینان کی ایسی ٹھنڈک نصیب ہوئی کہ میں عموماً دھوپ ہی میں ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کرتا اور اگر دیکھتا کہ زیادہ لمبی چوڑی دعا مانگنے کا موقع نہیں ہے تو بس اتنی ہی دعا پر کفایت کر لیتا۔ میں نے اس جگہ اللہ کے بندوں اور بندیوں کی ایسی رقت انگیز دعائیں بھی سنیں جن کو سن کر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ دعائیں براہ راست اس گھر کے رب کی طرف سے مانگنے والوں اور مانگنے والیوں کے دلوں اور زبانوں پر القا ہو رہی ہیں۔ بعض لوگ اس طرح زار و قطار روتے کہ ان کی حالت دیکھ کر دل اللہ تعالیٰ کے ایمان و یقین سے لبریز ہو جاتا۔ بہت سے لوگ اپنی صورت و ہیئت سے بالکل بے علم معلوم ہوتے تھے لیکن ان کا سوز و گداز بڑے بڑوں کے لیے قابل رشک ہوتا۔ خانہ کعبہ کا ماحول رو رو کر دعائیں کرنے والوں سے ہر وقت اس طرح آباد رہتا ہے کہ بے حس سے بے حس انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے وہاں بدل جاتا ہے۔ وہاں صاف نظر آتا ہے کہ الحاد اور بے دینی سے بھری ہوئی اس دنیا میں خدا کو صدق دل سے ماننے والے اور اس سے ڈرنے والے اب بھی موجود ہیں۔

حطیم میں میں حطیم میں بہت کم جاتا تھا۔ میری اہلیہ زیادہ تر حطیم میں بیٹھتی تھیں اور ان کو وہاں بیٹھنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے میرے اوپر بار بار یہ اعتراض کیا کہ میں حطیم میں بہت کم جاتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہاں عورتیں زیادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے مجھے وہاں جانے میں تکلف ہوتا ہے لیکن وہ مصر ہوئیں کہ مجھے حطیم میں ضرور دعا اور نفل کے لیے جانا چاہیے بالآخر مناسب اوقات میں تھوڑی دیر میں حطیم میں بھی بیٹھنے لگا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ اس حطیم کا کل حصہ یا اس کا اکثر حصہ بہرحال بیت اللہ کا جزو ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیتا اور آپ اس کو بیت اللہ میں شامل کر دیتے۔ خود حضورؐ کے متعلق بھی معلوم ہے کہ حضورؐ اس حصہ کو بیت اللہ میں شامل کرنا پسند فرماتے تھے لیکن پسند فرمانے کے باوجود آپ نے اس کو شامل نہیں فرمایا حالانکہ اگر حضورؐ یہ کر دیتے تو کوئی آپکے

اس ارادہ میں مانع نہیں ہوسکتا تھا۔ تاریخ میں ایک بار یہ خانہ کعبہ میں شامل بھی کیا جا چکا ہے لیکن پھر یہ اپنی سابق حالت میں کر دیا گیا۔ میں نے خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ ہم جیسے کمزوروں کا حصہ ہے۔ اگر یہ خانہ کعبہ میں شامل کر دیا گیا ہوتا تو بھلا ہم جیسے کس مپرسوں کو اس مقدس ٹکڑے پر سجدہ کرنے کی سعادت ... کہاں حاصل ہو پاتی۔ ایک روز ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بیت اللہ کے اندر نہیں گئے۔ میں نے کہا میرے یہ نصیب کہاں۔ البتہ تھوڑی دیر حطیم میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور میرے لیے یہ دردِ تہہ جام ہی بہت ہے۔

بیت اللہ کے اندر بیت اللہ کے اندر داخل ہونے کی آرزو بھلا کس مسلمان کے دل میں نہ ہوگی۔ میں نے اس آرزو کا اظہار تو کسی پر نہیں کیا لیکن دل میں اس کو رکھا برابر۔ حج کے بعد ایک روز جب میں طواف کے لیے گیا تو میں نے دیکھا کہ بیت اللہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، سامنے ایک چھوٹی سی لکڑی کی سیڑھی لگی ہوئی ہے، داخل ہونے والوں کا ہجوم ہے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ جو اندر ہیں وہ دھکے دے کر نکالے جا رہے ہیں، جو باہر ہیں وہ سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، بچے چیخ رہے ہیں، عورتیں شور کر رہی ہیں، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں اور کلید بردار صاحب اور ان کے آدمی بخشش وصول کر رہے ہیں اور جن سے بخشش نہیں مل رہی ہے ان کو دھکے دے رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ دل میں کر لیا کہ اگر اس سب سے محترم گھر میں داخل ہونے کے لیے ان ناگوار حالات سے گذرنا ہے تو میں اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی کوشش نہیں کروں گا۔

اتفاق کی بات کہ جو وقت میرے طواف کا تھا وہی وقت کلید بردار صاحب نے خانہ کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ میں اس طرح کا منظر روز دیکھتا اور اس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی لیکن بیت اللہ کے اندر داخل ہونے کی آرزو بڑی شدید ہوتی ہے اس وجہ سے ان تمام ناگواریوں کے باوجود طواف کرتے ہوئے جب میں بیت اللہ کے دروازے کے سامنے سے گذرتا تو دروازے کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گذرتا کہ شاید کسی دن اس گنہگار کی باریابی بھی ہو جائے لیکن یہ سعادت میری قسمت میں نہیں تھی۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ داخل ہونے والوں کی کشمکش اس قدر

بڑھ گئی ہے کہ چند آدمی عین بیت اللہ کے دروازے پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک صاحب کی تہمد نیچے گر گئی اور ایک صاحب کو چوٹ بھی آئی۔ بالآخر حرم کی پولیس کو مداخلت کرنی پڑی تب کہیں جا کے معاملہ رفع دفع ہوا۔ میرے اوپر اس واقعہ کا اس قدر سخت اثر پڑا کہ میں اپنا طواف ناتمام چھوڑ کر دور جا کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں اس بات سے بالکل مایوس ہو گیا کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہونے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہو سکے گی۔ اس مایوسی کے بعد حطیم سے میری دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ان ناگوار حالات کی شکایت میں نے شعبہ امر بالمعروف کے نائب صاحب سے کی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ کلید بردار صاحب کو تو اس طرح بیت اللہ کا دروازہ کھولنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے مفاد کے لیے من مانے طور پر اس طرح کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ختم ہونا ضروری ہے۔ یہ بیت اللہ کے احترام کے بالکل منافی ہے۔ اس کے بجائے کوئی ایسی شکل اختیار کی جانی چاہیے جس سے ہر آرزو مند کی آرزو کم از کم ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر پوری ہو سکے۔ حکومت اگر چاہے تو ایسی کوئی شکل بڑی آسانی سے اختیار کر سکتی ہے۔

اہل مکہ اور حرم حج سے پہلے تک میرا احساس یہ تھا کہ اہل مکہ حرم کی حاضری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے لیکن حج کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کی دلچسپی کچھ بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اہل مکہ کی خواتین بھی خاص خاص دنوں میں زیادہ آنے لگی ہیں اور مردوں کی تعداد بھی نسبتہً زیادہ ہوئی ہے۔ میں نے بعض لوگوں کے سامنے اپنے اس احساس کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ حج کے دنوں میں اہل مکہ حاجیوں کے لیے یہ ایثار کرتے ہیں کہ وہ حرم میں کم آتے ہیں۔

حج کے بعد خاص طور پر یہ لوگ جمعرات کی شام کو حرم میں زیادہ آنے لگے۔ عورتوں کا پلاٹ بھی اہل مکہ کی خواتین سے بھر جاتا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جمعرات ان لوگوں کے ہاں بھی عبادت کے لیے خاص سمجھی جاتی ہے۔

حرم میں تقریریں اور درس حرم میں حجاج کی تعلیم و تربیت کی غرض سے اس دوران میں کچھ تقریروں اور درس کا اہتمام بھی ہوتا ہے لیکن جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں یہ تقریریں اور یہ درس کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سعودی حکومت ایک منصوبہ کے تحت اس کام کو کرے

اور اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حجاج ان دو تین مہینوں کے اندر جو وہ حرمین میں گذارتے ہیں، قدم قدم پر کچھ نہ کچھ سیکھیں۔ حج کے دوران میں حاجیوں کے اندر دین سیکھنے کا رجحان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس رجحان سے ان تمام لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے جن پر تعلیم دین کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ حاجیوں سے متعلق سعودی حکومت پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عاید ہوتی ہے۔

ان تقریروں میں کچھ حصہ ہمارے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے بھی لیا اور اپنی ایک تقریر میں توحید کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے مردہ خداؤں کے ساتھ ساتھ زندہ خداؤں پر بھی تنقید کر ڈالی اور اس ضمن میں شاید جلالۃ الملک کا بھی حوالہ دے ڈالا۔ ہمارے ایک ساتھی بھاگے ہوئے آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب کی خبر لیجئے انھوں نے آج اپنی تقریر میں جلالۃ الملک کا بھی نام لیا ہے، اگر جلالۃ الملک کی سی، آئی ڈی متوجہ ہو گئی تو کیا ہوگا؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ مطمئن رہیں، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ حکیم صاحب جانتے ہیں کہ حکومت ان کے گھر کی ہے۔ بالفرض ان کی تقریر قابل اعتراض بھی ہوتی تو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ حکیم صاحب پروگرام سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔

جلالۃ الملک کا طواف

اسی دوران میں ایک روز جلالۃ الملک اپنے وزرا اور حکام کے ساتھ طواف کے لیے تشریف لائے۔ جو دن ان کے طواف کے لیے مقرر تھا اس دن صبح ہی سے حرم اور اس کے قرب وجوار میں فوجی دستے نظر آنے لگے۔ عصر کے وقت میں نے دیکھا کہ حرم کی چھتوں، اس سے متصل سڑکوں، اور حرم کے تمام گوشوں اور کونوں میں فوج کے آدمی کھڑے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان میں نے اپنے ایک طواف کا وقت مقرر کر رکھا تھا، اس دن جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج اسی وقت جلالۃ الملک طواف کریں گے۔ اگلا زمانہ ہوتا تو ایک بادشاہ اور ایک گدا دونوں بغیر کسی زحمت کے ایک ہی وقت میں طواف کر سکتے تھے لیکن اس زمانہ میں تو اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ آج میرے طواف کا موقع نہیں ہے، تو مطاف کے پلیٹ فارم پر بادشاہ کے طواف کی سیر کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مطاف اور مطاف میں داخل ہونے کا ایک طرف کا راستہ عام آدمیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا تھا۔ راستہ اور مطاف کو ہر طرف سے نجدی فوج کے سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پہلے جلالۃ الملک کے کچھ مقربین

آئے اور وہ کچھ دیر تک طواف کرتے رہے۔ اس کے بعد جلالۃ الملک، ان کے وزرا اور اعلیٰ حکام آئے اور انھوں نے طواف کیا۔

طواف کے بعد جلالۃ الملک اور ان کے ساتھیوں نے مغرب کی نماز حرم میں پڑھی۔ پہلی رکعت کے سجدے سے جب میں نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف سے کچھ مسلح فدائی اثنائے نماز میں بھی صفوں کے درمیان جلالۃ الملک کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بادشاہ ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے۔ عین حرم الٰہی میں جب میں نے دیکھا کہ جلالۃ الملک کی ذات کے لیے اتنے خطرے ہیں تو میں نے اپنی خوش قسمتی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں اس کی عنایت سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔

آگ کا حادثہ

جس دن جلالۃ الملک طواف کے لیے آئے اسی دن مکہ معظمہ کی تاریخ کا ایک بہت بڑا حادثہ ظہور میں آیا۔ جلالۃ الملک طواف اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد طائف کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں حرم میں ہم جوں ہی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے حرم کے بالکل پاس کے ایک مکان سے دفعۃً آگ کے شعلے نمودار ہوئے۔ آناً فاناً یہ آگ پورے ایک محلہ میں پھیل گئی۔ یہ محلہ بہت ہی گنجان آباد تھا اور دکانیں بھی بڑی بڑی زیادہ تر اسی محلہ میں تھیں۔ مکہ کا فائر بریگیڈ اگرچہ وقت پر پہنچ گیا لیکن تنگ گلیوں کے اندر اس کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ دور سے جو پانی پھینکنے کی کوشش کی جاتی آگ کے شعلے اس کو گرنے سے پہلے ہی بھاپ بنا کر اڑا دیتے۔ دیکھتے دیکھتے یہ آگ ان عمارتوں تک پہنچ گئی جن کی کھڑکیاں حرم کی چھتوں پر کھلتی تھیں۔ ہر طرف واویلا مچ گیا۔ بچے، جوان، عورتیں، مرد سب ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں نے باب ابراہیم کے سامنے والی سڑک سے آگ کے صحیح موقع کا اندازہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اب حرم (صانہ اللہ) بھی آگ کی زد میں ہے۔ آگ کے اتنے بڑے بڑے انگارے فضا میں اڑتے تھے کہ جس مکان پر وہ گرتے ان سے آگ لگ سکتی تھی۔ مجھے جب یہ خیال آیا کہ خدانخواستہ یہ انگارے بیت اللہ پر بھی گر سکتے ہیں تو میرا دل بیٹھنے لگ گیا۔ میں نے اور میری اہلیہ نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر یا نار کونی برداً وسلاماً کا ورد شروع کر دیا۔ میری خاص دعا انتہائی بے قراری کے ساتھ بس یہ تھی کہ اے رب ابراہیم، حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کو تو آگ سے محفوظ رکھ۔

جب آگ کا زور زیادہ بڑھا اور معلوم ہوا کہ سارا مکہ اس کی لپیٹ میں آجائے گا تو میری اہلیہ نے کہا کہ حرم میں چلو اور غلاف کعبہ پکڑ کر دعا کرو ۔ ہم دونوں حرم میں پہنچے ۔ وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے مکانوں کے سامان کھڑکیوں سے حرم کی چھتوں پر پھینک رہے ہیں اور آگ پورے زور کے ساتھ بڑھتی آرہی ہے ۔ یہاں تک کہ حرم کا کتب خانہ اور اس کا ایک طرف کا سامان بھی لا لاکے صحن میں ڈالا جارہا ہے لیکن مطاف میں طواف کرنے والوں کا وہی حال ہے جو عام حالات میں ہوا کرتا ہے ۔ گویا انھیں اس حادثہ کی کوئی خبر ہی نہیں ہے ۔ ایسے نازک موقع پر دلوں کا یہ اطمینان میں نے اسی گھر میں دیکھا ۔

حکومت کے ذمہ داروں نے جب دیکھا کہ معاملہ مکہ کے فائر بریگیڈ کے قابو سے باہر ہے تو انھوں نے جدہ بھی اطلاع بھیج دی اور فوج بھی بلالی ۔ علاوہ ازیں امیر فیصل کو بھی اطلاع کردی جو جلالۃ الملک کے ساتھ طائف جارہے تھے اور ابھی کہیں راستے ہی میں تھے ۔ جدہ کا فائر بریگیڈ جب پہنچا تو اس نے ہر طرف سے آگ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی اور اس کی کوشش نتیجہ خیز ہوئی ۔ اس نے ایک تدبیر یہ بھی کی کہ حرم کا ایک دروازہ توڑ کر اپنے انجن اور پانی کی گاڑیاں حرم کے اندر گھسا دیں ۔ اس پر حرم کے منتظمین کو ابتداءً کچھ اعتراض ہوا لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ یہ تدبیر اختیار کیے بغیر اب حرم بلکہ خود مکہ کو بھی بچانا مشکل ہے تو مجبوراً انھیں اجازت دینی پڑی ۔ یہ تدبیر بہت کامیاب رہی ۔ فائر بریگیڈ والوں نے اذان کے میناروں پر چڑھ کر جب پانی پھینکنا شروع کیا تب محسوس ہوا کہ اب آگ کا تمرد کچھ دھیما پڑنا شروع ہوا ۔

یہ آگ سب سے زیادہ گنجان اور آباد محلہ میں لگی تھی اس وجہ سے مالی نقصان بھی بہت ہوا اور جانیں بھی بہت ضائع ہوئیں لیکن پریس میں اس کی تفصیلات نہیں آئیں ۔ پہلے تو یہ بات ہمیں کچھ قابلِ اعتراض معلوم ہوئی کہ اتنے بڑے حادثہ کو حکومت نے چھپانے کی کوشش کی لیکن بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ سعودی حکومت نے یہ کام بڑی دانشمندی کا کیا ۔ یہ زمانہ حج کا تھا ۔ اگر اس حادثہ کی تفصیلات اخباروں میں چھپتیں تو ہر ملک کے وہ سارے لوگ سخت تشویش و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے جن کے عزیز یا دوست حج کے لیے گئے ہوئے تھے ۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ امیر فیصل کو راستہ میں جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنا سفر منسوخ کر کے راتوں رات مکہ معظمہ واپس آگئے ، اور فوراً متاثرہ علاقہ میں پہنچ کر

وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی بھی کی اور پوری فیاضی کے ساتھ تمام نقصانات کے معاوضہ دینے کا بھی اعلان کردیا ۔

بعد میں جب اس حادثہ کی تحقیقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس عظیم حادثہ کا اصل سبب ایک صاحب کی معمولی سی غفلت ہے ۔ ایک حاجی صاحب اپنا اسٹو جلتا ہوا چھوڑ کر حرم میں عشاء کی نماز پڑھنے چلے آئے ۔ اسٹو پھٹ گیا اور اس کے پھٹنے سے پاس پڑے ہوئے سامان نے آگ پکڑ لی ۔ مکہ کے عام مکانوں کی تعمیر میں میرا اندازہ ہے کہ لکڑی کا استعمال بہت غلط طریقہ پر ہوتا ہے ۔ چھوٹی چھوٹی چھتیں ہوتی ہیں اور ان کے پردے عموماً لکڑی کے پھٹوں کے ہوتے ہیں ۔ کوئی بد احتیاط آدمی اگر چھت پر کھانا پکائے تو اس کی معمولی سی بے احتیاطی سے مکہ کی گرم و خشک ہوا میں ان لکڑیوں میں آگ لگ سکتی ہے ۔ حاجی بیچارے اول تو عام طور پر اسٹو وغیرہ کے استعمال کے معاملہ میں اناڑی ہوتے ہیں ۔ دوسرے اناڑی نہ بھی ہوں تو ہر شخص میں اتنی احتیاط کہاں ہوتی ہے کہ وہ کسی چیز کے نتائج اتنی دور تک سوچ سکے ۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام کا موجودہ نظام نہایت ناقص ہے ۔ حجاج کے قیام کے لیے حکومت کو اپنے اہتمام میں مکانات بنوانے چاہئیں ۔ اور اگر فی الحال موجودہ سسٹم ہی کو باقی رکھنا ناگزیر ہو تو پھر کم از کم جو لوگ اپنے مکانات کرایہ پر چلانے کے لیے بنائیں ان کو کچھ ضروری شرائط کا پابند کرنا چاہیے ۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو جو حیاتِ جاودانی اعلیٰ وارفع حاصل ہے
(بابت ماہ دسمبر و جنوری)
اُس کو سمجھنے کے لیے رسالہ **حنفیہ** کا حیات النبیؐ نمبر ملاحظہ کریں
اس بلند پایہ نمبر میں جن اکابر علماء اسلام کے مضامین درج ہیں ان میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں :-
(۱) حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (۲) مورخ الاسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ ۔ (۳) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (۴) شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۵) شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی (۶) شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری (۷) مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی (۸) حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (۹) حضرت مولانا مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ، دفتر جامعہ حنفیہ شبلی روڈ لاہور سے طلب کریں

مراسلہ و مذاکرہ

از: ادارہ

حکومتی اقتدار اور اصلاح معاشرہ
اسلام میں شوریٰ کی حیثیت
غیر اسلامی حکومتوں کے مسلمانوں کیلیے رہنما اصول

س: بعض ذی علم علماء کی تحریر و تقریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "حکومتی اقتدار" اللہ تعالیٰ کا انعام ہے جو عبادت، تسبیح و تقدیس اور گریہ و زاری کے نتیجہ میں بندے کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مل جاتا ہے۔ "اقتدار" بجائے خود حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے۔ دوسری طرف بعض ذی علم علماء اس کے بالکل برعکس رائے رکھتے ہیں، اور ان کے نزدیک حصول اقتدار ذریعہ اصلاح اور اصل دین و ایمان قرار پاتا ہے، انہی وقت کے مشہور و معروف علماء میں سے ایک .... صاحب کی تحریر نقل کر رہا ہوں۔

"اسلام چونکہ صرف عقائد و عبادات ہی کا داعی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی زندگی کی تنظیم خدا پرستی اور روحانیت و مادیت کے صحیح توازن کی بنیاد پر کرنے کا علمبردار ہے اور یہ کام بغیر حکومتی اقتدار کے پورے طور پر انجام نہیں پا سکتا، اس لیے حکومت بھی اسلام کے نظام و پروگرام کا اہم جزو ہے اور یہ مسلمان کا دین و ایمان ہے"۔ اس تحریر کی روشنی میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ اصل اصول "حکومتی اقتدار" قرار دیا جائے یا "اصلاح معاشرہ" اور اگر دونوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہو تو پھر ترتیب کیا ہو اور کسے کس درجہ میں رکھ کر کوشش کی جائے؟

ج: آپ نے حکومتی اقتدار سے متعلق جن دو گروہوں کی رائیں نقل فرمائی ہیں ان میں سے کسی گروہ کی رائے بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ "حکومتی اقتدار" ایک خاص قسم کی اجتماعی صلاحیت اور سیاسی تنظیم کا محتاج ہے۔ اگر کوئی جماعت اپنے اندر وہ تنظیم اور وہ صلاحیت پیدا کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو، اگر چاہتا ہے اقتدار اور حکومت بخش دیتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اس اقتدار کو پاکر یہ جماعت اس اقتدار کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ اس کو امن و عدل کے قیام کے لیے استعمال کرتی ہے یا اس کو پاکر زمین میں ظلم و فساد برپا کرتی ہے۔ عبادت، تسبیح و تقدیس، اور گریہ و زاری وغیرہ نہایت اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہیں لیکن اس اجتماعی صلاحیت اور تنظیم کے بغیر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے مجرد یہ چیزیں "حکومتی اقتدار" کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس بات کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ قدرت نے ایک خاندان کے وجود پذیر ہونے کے لیے یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت اپنی زندگی کے ایک خاص دور میں، رشتہ ازدواج میں جڑیں، آپس میں تعلقات زن و شو قائم کریں، اور کنبہ کا قیام اور خاندان کا تحفظ و انصرام فریقین میں سے ہر ایک سے جس محنت و سرگرمی اور جس ایثار و قربانی کا طالب ہے اس کا حق ادا کریں۔ اگر ایک شخص یہ شرطیں پوری نہیں کرتا لیکن عبادت و ریاضت اور تسبیح و تہلیل رات دن کرتا رہتا ہے تو گو یہ کام اس کے نیکی کے کام ہیں لیکن مجرد ان کاموں کی بدولت کوئی کنبہ وجود میں نہیں آجائے گا۔ میں اس امر سے انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو معجزے بھی ظاہر فرما دیتا ہے۔ لیکن اس دنیا کا کارخانہ معجزوں پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ایک خاص نظام طبعی و اخلاقی کا پابند ہے۔

اسی طرح دوسرے گروہ کی رائے بھی میرے نزدیک مغالطہ پر مبنی ہے۔ اس امر میں تو شبہ نہیں ہے کہ اسلام صرف عقائد و عبادات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وہ ہماری پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ اس وجہ سے حکومتی اقتدار عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام قائم کس طرح ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ ایک سیاسی نظام، خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، قائم ہوتا ہے ایک سوسائٹی اور ایک معاشرہ کے وجود پذیر ہونے سے۔ کسی حکومت کے وجود میں آنے کے لیے معاشرہ کا وجود ناگزیر شے ہے۔ معاشرہ ہی حکومت کو جنم دیتا ہے اور وہی اس کو قائم بھی رکھتا ہے۔ حکومت کا مزاج اس معاشرے کے مزاج کے

تابع ہوتا ہے جو معاشرہ اس حکومت کو وجود بخشتا ہے۔ اگر معاشرے کا مزاج کافرانہ اور فاسقانہ ہے تو اس کے بطن سے جو حکومت جنم لے گی اس کا مزاج بھی کافرانہ اور فاسقانہ ہوگا اور اگر کسی معاشرے کا مزاج مومنانہ اور مسلمانہ ہوگا تو اس کے ذریعہ سے وجود پذیر ہونے والی اور اس کے دودھ سے پلنے والی حکومت بھی مومنانہ مزاج رکھنے والی ہوگی۔ کسی معاشرہ کے وجود پذیر ہوئے بغیر کسی حکومت کا وجود پذیر ہو جانا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح دیوار کے قائم ہوئے بغیر چھت کا قائم ہو جانا اور کسی کافرانہ معاشرہ کے اندر سے کسی مومنانہ حکومت کا ابھر آنا ویسا ہی ناممکن ہے جس طرح کیکر کے درخت سے سیب کے پھل کا ظہور میں آنا۔

تاریخ میں اس امر کی مثالیں تو ملتی ہیں کہ ایک اسلامی حکومت نے باہر سے حملہ کرکے کسی غیر اسلامی معاشرے کو مفتوح کر لیا ہے اور اس پر اپنی حکومت قائم کر لی ہے لیکن کوئی ایک مثال بھی اس چیز کی نہیں ملتی کہ کسی غیر اسلامی معاشرہ نے از خود کسی اسلامی حکومت کو جنم دیا ہو۔ قدیم شخصی حکومتوں کے زمانوں میں تو اس بات کا امکان تھا کہ ولی عہدی اور وراثت کے راستے سے کسی برے معاشرے کو کوئی اچھا بادشاہ مل جائے لیکن اس زمانے میں جب کہ حکومتوں کے قیام میں معاشرے کی رائے اور اس کے انتخاب ہی کو اصل دخل حاصل ہے اس بات کا سرے سے کوئی امکان باقی ہی نہیں رہ گیا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے بغیر حکومت کی کوئی اصلاح ہو سکے۔ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتی اقتدار بجائے خود بھی اصلاح معاشرہ کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ بن سکتا ہے تو کیوں نہ پہلے اس کو حاصل کر لیا جائے اور اس کو حاصل کرکے اس کے ذریعہ سے معاشرہ کی اصلاح کی جائے تو مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ حکومتی اقتدار اصلاح معاشرہ کا بڑا موثر ذریعہ بن سکتا ہے لیکن اس کے حاصل ہونے کا راستہ کیا ہوگا؟ اگر کوئی شخص انقلابی طریقوں پر اعتقاد رکھتا ہے تو اس کی بات الگ ہے یہاں چونکہ زیر بحث مسئلہ یہ نہیں ہے اس وجہ سے میں اس طریقے کی کامیابی یا ناکامی پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن جو لوگ موجودہ آئینی اور جمہوری طریقے ہی اختیار کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پہلے حکومتی اقتدار حاصل کریں گے اس کے بعد اصلاح معاشرہ کریں گے، میرے نزدیک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ان کا تجربہ ایک بالکل انوکھا تجربہ ہوگا۔ کہانیوں کی کتابوں میں چوہوں کی ایک کانفرنس کی قرارداد نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے بلی کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے یہ تجویز سوچی تھی کہ اس کے گلے میں ایک

گھنٹی باندھ دی جائے لیکن جب تجویز کو عمل کا جامہ پہنانے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ تجویز تو بہت خوب ہے لیکن اس کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے کوئی سورما چوہا نہیں مل رہا ہے۔ اسی طرح کسی بگڑے ہوئے معاشرے کو صالحین کی حکومت کے ذریعہ سے صالح بنا لینے کی راہ تو بہت ہی مختصر اور آسان ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کے منہ زور مرکب کی پیٹھ پر صالحین سوار کس طرح ہوں گے؛ اور بالفرض ایک مرتبہ کسی طرح کود پھاند کر پیٹھ تک پہنچ بھی گئے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ایسی جھرجھری نہیں لے گا کہ سب چاروں شانے چت گریں اور اس طرح گریں کہ پھر اصلاح معاشرہ کا نام لینے کے قابل بھی نہ رہیں۔

س: پھر آگے چل کر مصنف لکھتے ہیں:۔

"اسلامی نظام حکومت میں خلیفہ کو شوریٰ کا پابند کیا گیا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو صاحب وحی بھی تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے کہ پیش آمدہ معاملات اور مہمات کے بارہ میں (جن میں وحی نے رہنمائی نہ کی ہو) اپنے اصحاب و رفقا سے مشورہ کریں (وشاورھم فی الامر) قرآن مجید ہی میں ایک دوسری جگہ امت محمدیہ کا لائحہ عمل اور دستور بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "وامرھم شوریٰ بینھم" اور ان کے کام باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔"

اس اصل اصول کے بعد مصنف نے اپنے طور پر جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

"لیکن اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یہ یقین ہو کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہی صحیح ہے، اور اس کے خلاف چلنے میں بڑا خطرہ ہے، تو شوریٰ کے اختلاف رائے کے باوجود وہ اپنے یقین و شرح صدر کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کر سکتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عملی دنیا میں یہ بالکل ناگزیر ہے اور آج کی جمہوریتوں میں بھی بکثرت ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔"

دوسری عبارت ملاحظہ ہو:

اسلامی حکومت کے امتیازی اصولوں میں سے ایک یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جو شخص کسی حکومتی عہدے کا طالب یا خواہش مند ہو اس کو عہدے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے خاندان کے دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حکومتی

عہدے کے لیے درخواست کی تو آپ نے فرمایا انا واللہ لا نولی علیٰ ھذا العمل احداً سالہ ولا احداً حرص علیہ (رواہ بخاری و مسلم) خدا کی قسم، ہم کسی ایسے آدمی کو کوئی حکومتی عہدہ سپرد نہیں کرتے جو اس کے لیے خود طالب اور حریص ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح حکم کے بعد مصنف حکمت عملی کے حق میں استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :—

" عام اصول تو یہی ہے لیکن اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر یہ محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کو پیش کر دے اور حکومت کے ذمہ دار لوگ مطمئن ہوں تو وہ خدمت اس کے سپرد کر سکتے ہیں"

براہ کرم ان تمام نتائج فکر کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرمائیے۔

ج : اس امر میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یقین ہو کر جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہی صحیح ہے، اس کے خلاف راہ اختیار کرنے میں بڑا خطرہ ہے تو وہ اپنے یقین کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کر سکتا ہے، لیکن خلیفہ کو یہ بات ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کوئی معصوم ہستی نہیں ہے، اس وجہ سے اجتہادی اور معلق امور (اور شوریٰ کا تعلق اسی طرح کے امور سے ہوتا ہے) میں اس کو دوسرے اہل الرائے کے مقابل میں اپنے یقین اور اپنی رائے کو اس درجہ اہمیت دینے اور اس کے مانے جانے پر اصرار کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنہا رائے کے مقابل میں دوسرے اہل الرائے کی متفقہ رائے یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد کر دے۔ اگر ایک امر اجتہادی میں کوئی خلیفہ اپنے یقین کو اس درجہ شک و شبہ سے بالاتر سمجھتا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک معصوم ہستی سمجھتا ہے۔ آخر اس کے پاس اس امر کے لیے کون سی شک و شبہ سے بالاتر دلیل موجود ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہی حق ہے، جو دوسرے سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہے، اس کے پاس اگر کچھ دلائل ہیں تو وہ اپنے دلائل پوری تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتا ہے اور پورے زور و قوت اور اصرار و تاکید کے ساتھ پیش کر سکتا ہے لیکن اسے یہ فیصلہ اہل الرائے پر چھوڑنا چاہیے کہ وہ اس کے دلائل سے قائل ہو کر اس کے ہم نوا بنتے ہیں یا نہیں بنتے۔ اسلام نے اس کو یہ حق ہرگز نہیں دیا ہے کہ اگر اہل الرائے اس کے دلائل سے قائل نہیں ہوتے تو اپنے اصرار کے زور سے ان کو قائل ہونے پر مجبور کر دے یا شوریٰ کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دے۔ اگر وہ یہ حق حاصل کر لے تو پھر اسلام میں شورائیت بے معنی ہو کر

نہیں پیدا ہوتی۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں خلیفہ کو کبھی شورائیت کے نظام کو معطل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے نہایت ہی اہم حالات کے زمانے تھے، لیکن انھیں ایک دن کے لیے بھی شورائیت کو معطل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اسلامی حکومت میں کسی مسلمان کے لیے کسی عہدے کی طلب اور تمنا اس اعتبار سے ایک ناپسندیدہ بات ہے کہ اسلام میں ہر عہدہ کے ساتھ بہت سی اخروی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ اگر ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے کسی ذمہ داری سے بری رکھا ہے تو اس کی عاقبت بینی اور خدا ترسی کا تقاضا یہی ہونا چاہیے کہ وہ از خود اس ذمہ داری کے لیے طالب اور متمنی نہ بنے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کسی نے کسی منصب اور عہدہ کے لیے خواہش کر دی تو اس کی یہ خواہش اس کے اس منصب کے لیے اس کی نااہلیت (DISQUALIFICATION) کی کوئی مستقل دلیل بن گئی۔

اسلام میں جس طرح مناصب اور عہدوں کی طلب و تمنا ایک ناپسندیدہ بات ہے اسی طرح ذمہ داریوں سے گریز و فرار بھی ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ جب لوگوں کے اندر سرکاری ذمہ داریوں سے گریز کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں لوگوں کو بڑی سختی سے ڈانٹا کہ اگر آپ لوگ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے اسی طرح گریز کرتے رہے تو میں حکومت چلانے کے لیے آدمی کہاں سے لاؤں گا۔

ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس معاملہ میں صحیح اسلامی نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات تو ناپسندیدہ ہے کہ وہ کسی عہدہ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کرے لیکن اگر کوئی ذمہ داری اس پر ڈال دی جائے تو اپنے اندر اس کی صلاحیت پاتے ہوئے اس سے گریز نہ کرے۔ بعض مواقع ایسے بھی پیش آ سکتے ہیں جب کہ وہ خود یا دوسرے ذی فہم لوگ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہی اس کا اہل ہے کہ اس ذمہ داری کو سنبھالے ورنہ کام خراب ہو جائے گا جس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ایسے حالات میں اس کا فرض ہے کہ وہ خود بڑھ کر اس ذمہ داری کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اندیشہ ہے کہ اس سے خدا کے ہاں اس بات پر مواخذہ ہو جائے کہ اس نے ایک ذمہ داری سے صلاحیت رکھتے ہوئے گریز کیا جس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس مقصد کے لیے اس قسم کے مصنوعی طریقے اور لاحاصل بہانے نہیں پیدا کرنے چاہئیں جس قسم کے طریقے اور بہانے اس زمانے میں وہ لوگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شریعت کے معاملہ میں گندم نمائی اور جو فروشی کا کاروبار کر رہے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی حکومت میں عہدوں کی طلب و تمنا اور ان سے گریز و فرار دونوں ہی باتیں معیوب ہیں۔ صحیح راہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ طلب و تمنا بھی زیادہ معیوب وہاں ہے جہاں طمع کے امکانات غالب ہوں۔ جہاں طمع سے زیادہ خطرات و مشکلات کا امکان ہو وہاں تو ذی صلاحیت لوگوں کو خود بڑھ بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنا مطلوب ہے۔ جب صحیح راہ طلب و تمنا اور گریز و فرار دونوں کے درمیان ہوئی۔ اور یہی اسلام کی اصلی راہ ہے تو یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز حرام ہونے کے باوجود اس لیے جائز ہو گئی ہے کہ یہ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔

س : غیر اسلامی حکومتوں کے مسلمانوں کے لیے مصنف مذکور نے مندرجہ ذیل رہنما اصول بتایا ہے۔ اس کے متعلق بھی اپنی رائے لکھیے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ان کے اپنے ملکوں کے جو حالات ہوں اور جو نظام حکومت وہاں قائم ہو اس کو ایک نفس الامری حقیقت اور ایک واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اور موافق اور ناموافق امکانات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے ان کو اپنا لائحہ عمل تجویز کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں شریعت کے معروف اصول "اختیار النفع و دفع الضر" کو بطور رہنما اصول کے اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ اسی اصول کی رہنمائی میں وہ مختلف حالات میں حکومت میں شرکت یا عدم شرکت، تعاون یا عدم تعاون وغیرہ کا فیصلہ کریں گے۔"

ج : یہ بات میرے علم میں پہلی بار آ رہی ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں کے مسلمانوں کے لیے رہنما اصول "اختیار النفع و دفع الضر" کا اصول ہے۔ میں ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے رہنمائی دینے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید اللہ کے ایک ایسے ہی بندے پر اترا ہے جو ایک غیر اسلامی حکومت میں پیدا ہوا، اسی کے اندر جوان ہوا اور اسی کے اندر اس نے کام شروع کیا۔ اس قرآن نے کہیں بھی یہ نہیں بتایا ہے کہ غیر اسلامی

حکومتوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے رہنما اصول "اختیار انفع و دفع اضر" کا اصول ہے، وہ اس کو سامنے رکھ کر ان غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے اپنا لائحہ عمل بنا لیا کریں۔

ہر غیر اسلامی ماحول میں مسلمانوں کا لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت کی دعوت دیں اور اس ماحول میں جو کام نیکی اور بھلائی کے ہو رہے ہوں ان میں شریک ہوں اور جو کام برائی کے ہوں ان سے سمجھا بجھا کر اللہ کے بندوں کو روکنے کی کوشش کریں۔ قرآن میں مسلمانوں کا یہی مشن بتایا گیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھائے گئے ہو) اس مشن کا تقاضا یہ ہے کہ جس غیر اسلامی حکومت کے اندر بھی مسلمان موجود ہوں وہاں وہ اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ اس حکومت کے ہر اچھے کام کے دل و جان سے ساتھی ہیں، صرف برائی کے کام ایسے ہیں جن سے وہ خود بھی بچتے ہیں اور اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لائحہ عمل پر چل کر تھوڑے تھوڑے مسلمانوں نے کفر و جاہلیت کے بڑے بڑے علاقوں کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔ اگر وہ اختیار انفع و دفع اضر، کے فلسفہ کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل بنانے والے ہوتے تو اپنے ماحول میں موقع پرست اور ابن الوقت مشہور ہو کے رہ جاتے اور کوئی ان کی بات پوچھنے والا بھی نہ ملتا۔ اس طرح کے موقع پرست کبھی اسلام کے مشن کے لیے کوئی مفید کام نہیں کر سکتے بلکہ اندیشہ ہے کہ اپنی اس پالیسی سے اگر وہ ایک کو اپنا دوست بنانے میں کامیاب ہوں گے تو دس کو اپنا دشمن بنا لیں گے اور اس طرح اپنے آپ کو بھی اور اپنے ساتھ اسلام کے نام کو بھی سخت نقصان پہنچائیں گے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت کا ہر جزو اور ہر کام حرام ہی ہوتا ہے اور اس سے تعاون کی ہر شکل ناجائز ہے۔ ایک غیر اسلامی حکومت بھی معروف اور منکر دونوں قسم کے اجزا اور دونوں ہی طرح کے کاموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ معروف میں تعاون اس وجہ سے بدی نہیں بن جائے گا کہ وہ معروف ایک غیر اسلامی حکومت کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔

اسی طرح ایک اور حقیقت کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ہر غیر اسلامی حکومت کا درجہ

اسلام میں ایک ہی نہیں ہے۔ ایک غیر اسلامی حکومت تو وہ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہے، اور ایک غیر اسلامی حکومت وہ ہے جس میں مسلمانوں کو از روئے آئین و قانون حقوق حاصل ہیں۔ ان دونوں قسم کی حکومتوں کے ساتھ اندر کے مسلمانوں کے بھی اور باہر کے مسلمانوں کے بھی تعلق کی نوعیت الگ الگ ہے۔ اس فرق کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور اس فرق کو اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے۔

علاوہ ازیں اس سلسلہ کی ایک اور بنیادی حقیقت بھی ہر مسلمان کے پیش نظر رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ اسلام کے اصولوں پر ایک خالص اسلامی حکومت کے قیام کی ذمہ داری ایک آزاد اسلامی معاشرہ پر عائد ہوتی ہے۔ جو مسلمان غیر اسلامی حکومتوں کے اندر رہتے بستے ہیں ان کے اوپر اسلام کی طرف سے صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی اور اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کے آخری رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دیں اور ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات کی خوبیاں واضح کریں۔ اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت کے نہ وہ مخاطب ہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر حالت کے اندر اسلام مسلمانوں ہی پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت لے کر اٹھیں۔

یہ سارے اصول خود قرآن اور سنت میں بیان ہوئے ہیں اور حضرت انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کو ملحوظ رکھا ہے لیکن اس زمانہ میں عام طور پر لوگ اس ترتیب و تدریج کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو انبیاء علیہم السلام کے طریق کار کے اندر پائی جاتی ہے البتہ یہ کرتے ہیں کہ جب اپنی بے تدبیری و بے ترتیبی کے سبب سے الجھنوں میں پھنستے ہیں تو "اختیار انفع و دفع اضر" "حکمت عملی" اور اختیار اھون البلیتین" وغیرہ کے سوراخوں میں چھپتے پھرتے ہیں۔

ماعز اسلمی

س: حکمت عملی کے فلسفہ کی تردید میں آپ نے جو کچھ میثاق میں لکھ دیا ہے اب اس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ساری بات سمجھ چکے ہیں۔ اکثر کے . . . . . . میں

جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کو دلیل کہا جاسکے اس وجہ سے اس پر کچھ نہ لکھا جائے تو بہتر ہے۔ اگر آپ کسی بات کی وضاحت کرنا ضروری ہی سمجھیں تو ماعز اسلمی کے متعلق ان کے قبیلہ کے بعض لوگوں کا یہ بیان جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ بہت صالح آدمی تھے اس کی حقیقت واضح کر دیجیے۔ ہمیں تو اب میثاق میں افادات فراہیؔ کے باب کا انتظار ہے۔

ج: ماعز کے واقعہ سے متعلق جن بزرگ نے میری دیانت پر اعتراض فرمایا ہے یا تو انھوں نے اس تحقیق کی نوعیت نہیں سمجھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کے متعلق فرمائی یا ان فقروں کا ترجمہ اور مطلب وہ نہیں سمجھ سکے جو ماعز کی قوم کے بعض لوگوں کی طرف سے ماعز کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق کے جواب میں کہے گئے۔

ماعز کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تحقیق نہیں فرمائی تھی کہ یہ صالح آدمی ہیں یا غیر صالح۔ ان کی طرف سے ارتکاب زنا کے جرم کے اقرار کے بعد ان کے صالح یا غیر صالح ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بلکہ اسلام کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قابل حد جرم کا خود اقرار کرے تو مجرد اس کے اقرار کی بنا پر اس پر حد جاری نہیں کر دی جاتی بلکہ اس کے متعلق یہ تحقیق کی جاتی ہے کہ وہ اس جرم کی نوعیت سے ٹھیک ٹھیک واقف بھی ہے یا نہیں اور یہ اقرار وہ بحالت ہوش و حواس کر رہا ہے یا کسی دماغی خرابی کی حالت میں کر رہا ہے۔ اس قسم کی تحقیق موجودہ قوانین میں بھی ضروری سمجھی گئی ہے اور اس کے لیے ملزم کی دماغی حالت سے متعلق میڈیکل رپورٹ حاصل کی جاتی ہے، اس زمانہ میں اس چیز کو معلوم کرنے کے لیے ملزم کے جاننے پہچاننے والوں کا بیان لیا جاتا تھا چنانچہ اسلام کے اسی قانون کے بموجب حضورؐ نے ماعز کے اقرار کو ان پر حد جاری کرنے کے لیے کافی نہیں سمجھا بلکہ ان کی دماغی حالت کی بھی تحقیق فرمائی اور اس امر کی بھی ان سے اچھی طرح صراحت کرائی کہ جس جرم کا وہ اقرار کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

زنا کے فعل کی نوعیت واضح کرانے کے لیے حضورؐ نے ماعز سے یہ سوال کیا کہ ممکن ہے تم نے نظر ڈالی ہو، بوسہ لیا ہو، ممکن ہے صرف ہاتھ لگایا ہو؟ انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ میں نے فعل زنا کا ارتکاب کیا ہے؟ اس کے بعد حضورؐ نے ان سے سوال کیا کہ ابک جنون تم

کسی دماغی خرابی میں تو مبتلا نہیں ہو؟ انھوں نے جواب دیا نہیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے دوسروں سے سوال کیا کہ ابہ جنون ناخبرانہ لیس بمجنون فقال اشرب خمراً فقام رجل فاستنکھہ فلم یجد منہ ریح خمر (کیا یہ شخص کسی دماغی خرابی میں مبتلا ہے، آپ کو بتایا گیا کہ نہیں کوئی دماغی خرابی نہیں ہے، آپ نے سوال کیا، اس نے شراب تو نہیں پی ہے؟ ایک شخص نے ان کا منہ سونگھا لیکن اس نے شراب کی بو نہیں محسوس کی) پھر آپ نے ماعز کے قبیلہ کے لوگوں کے پاس آدمی بھیج کر ان سے دریافت کرایا کہ اتعلمون بعقلہ باساً تنکرون منہ شیئاً (کیا تم لوگوں نے اس کی عقل میں کوئی فتور محسوس کیا ہے، یہ فتور عقل کی باتیں کرتا ہے؟) ان لوگوں نے جواب دیا کہ ما نعلمہ الا وفی العقل من صالحینا فیما نری (ہم تو ان کو صحیح العقل اور اپنے علم کے حد تک ان کو اپنے بھلے چنگے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں۔)

یہ ساری تفصیل مسلم شریف کے ایک ہی باب میں موجود ہے۔ کون ذی ہوش آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کی یہ تفتیش ماعز کے صالح یا غیر صالح ہونے سے متعلق تھی۔ پھر ان کے صالح اور غیر صالح ہونے کی تحقیق کا فایدہ کیا تھا؟ ماعز صالح تھے تو اس سے نفس معاملہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیا کوئی شخص صالح ہو تو وہ محض اپنی صالحیت کی بنا پر زنا کی سزا سے بچ جائے گا اگر زنا کا ثبوت اس کے خلاف موجود ہے؟

تفتیش جو کچھ بھی وہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا اسلامی قانون کے تقاضے کے مطابق ماعز کی دماغی حالت سے متعلق تھی۔ اس تفتیش کے جواب میں ان کی قوم کے لوگ اگر کوئی بیان دے سکتے تھے تو ان کی دماغی حالت سے متعلق ہی دے سکتے تھے، ان کی اخلاقی حالت نہ یہاں زیر تفتیش تھی اور نہ اس بات کی کوئی اور وجہ موجود تھی کہ وہ اس کے متعلق بے ضرورت اپنی شہادت قلم بند کراتے۔

"وفی العقل" کے معنی ہیں صحیح العقل کے اور اس طرح کے سیاق و سباق میں "من صالحینا" کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ یہ ہمارے بھلے چنگے لوگوں میں سے ہے۔ یہ لفظ یہاں متقی اور نیکوکار کے مفہوم میں نہیں ہے۔

عربی زبان کا صحیح علم اور صحیح ذوق رکھنے والوں کو تو میری بات سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی لیکن عام لوگ جو لفظ صالح کے استعمالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ممکن ہے کچھ تردد محسوس م

م کریں تو ان کے اطمینان کے لیے بر سبیل تنزل گذارش ہے کہ فرض کر لیجئے کہ ماعز کے خاندان کے کچھ لوگ ان کی نسبت اچھی رائے رکھتے تھے تو اس سے ان معلومات کی کس طرح تکذیب تردید ہو جائے گی جو ماعز کے متعلق صحابہؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں تھیں۔

تاریخ وسیر

عہد صحابہؓ کے سب سے کمسن مفسّرِ قرآن

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جن لوگوں نے علم قرآن میں نمایاں شہرت حاصل کی ہے، ان میں خلفائے اربعہ کے علاوہ عبد اللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سب سے کمسن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ تھے۔ یہ ہجرت سے کل تین سال پہلے غالباً اس دور ابتلاء میں پیدا ہوئے جب قریش نے بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر رکھا تھا۔ اس حساب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ لیکن اس کمسنی کے باوجود اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی برکت سے یہ بہت جلد قرآن کے علم میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ نہ صرف اپنے ہم جنسوں اور معاصروں میں سب سے ممتاز ہو گئے بلکہ وقت کے اکابر کی بھی ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی کہ "اے اللہ ان کو حکمت اور تاویل قرآن سکھا" یہ دعا بجائے خود ان کی خداداد صلاحیتوں کی ایک زندہ جاوید شہادت ہے۔ آخر کچھ خاص جوہر ان کے اندر فہم قرآن کے نمایاں ہوئے ہوں گے۔ جب ہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ان کے لیے وہ دعا فرمائی جو عام حالات میں پختہ سال جوانوں اور بوڑھوں ہی کے لیے موزوں ہو سکتی تھی۔

کم عمری کے باوجود بڑوں کی نگاہوں میں انھوں نے جو درجہ حاصل کر لیا تھا، اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ حضرت عمرؓ جیسا شخص ان کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ "ابن عباس فتی الکھول لہ لسان سؤل وقلب عقول[1]" (ابن عباس اکابر کے طبقہ کے جوان ہیں، ان کو سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والا دل عطا ہوا ہے) حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر انسان کی زبان سے ۱۸-۲۰ سال کے ایک نوجوان کے لیے یہ تعریفی الفاظ اس قدر غیر معمولی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کو ذہانت و فطانت کے اعتبار سے ایک عبقری ماننا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے ان تین لفظوں کے اندر ان کا مرتبہ بھی واضح ہو گیا ہے، ان کا شوق علم بھی بیان ہو گیا ہے اور ان کی ذہانت کی بھی تعریف ہو گئی ہے اور ایسے پاکیزہ اور زوردار الفاظ میں ہوئی ہے کہ شاید ہی کسی نوجوان کو اس قسم کے الفاظ میں کسی اتنے بڑے آدمی کی تعریف نصیب ہوئی ہو، بالخصوص "فتی الکھول" کا خطاب دے کر تو حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کا درجہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس بلندی کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ ذرا خیال کیجیے کہ اس عہد مبارک میں کیسے کیسے بلند مرتبہ کہول و اکابر موجود تھے اور علم و تقویٰ اور فکر و اجتہاد کے اعتبار سے ان کے مرتبے کتنے بلند تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان ہی بزرگوں کی صف میں ابن عباسؓ جیسے ایک خورد سال کو بھی کھڑا کر دیا۔ اور اس اعلان کے ساتھ کہ یہ بھی ان ہی کے طبقہ کے ایک آدمی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اس دور کے ایک جلیل القدر مفسر تھے، ان کا جو مرتبہ ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ خود اپنی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ "اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں قرآن کی ہر آیت کی بابت جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلتا جو مجھ سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والا ہوتا اور سواریوں کے ذریعہ سے اس تک پہنچنا ممکن ہوتا تو اس کے پاس ضرور پہنچتا۔" لیکن اس جلالت مرتبہ کے باوجود حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں ان کا ارشاد یہ ہے کہ نعم ترجمان القرآن ابن عباس لو ادرک اسناننا ما عاشرہ منا رجل (کیا ہی خوب مفسر ہیں ابن عباس اگر وہ ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کی ہمسری کی جرأت نہ کر سکتا)

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاستیعاب: ذکر عبد اللہ بن عباس

اپنے سے ایک نہایت کم عمر صاحب علم کی یہ تعریف اور وہ بھی اسی فن میں جس فن میں تعریف کرنے والے کو خود امامت کا مقام حاصل ہے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے اگر ایک طرف تعریف کرنے والے کے ظرف کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اس نوجوان کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو رہا ہے جو اس کمسنی میں اپنے بڑوں سے یہ خراج تحسین حاصل کر سکا۔

حضرت عمرؓ کی طرف سے حوصلہ افزائی

حضرت ابن عباسؓ کی اس غیر معمولی صلاحیت اور خداداد ذہانت کے سبب سے حضرت عمرؓ ان کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے اور ان کی اس صلاحیت کو ابھارنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے مواقع برابر پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ انھیں مشورہ کی ان مجلسوں میں بھی بلا لیتے جن میں ان کی کمسنی کے سبب سے بعض بزرگوں کو ان کا بلایا جانا کچھ شاق گزرتا۔ اس دور کے بے نفس اور متقی لوگوں کو بھی بعض اوقات یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایسی مشکل گرہیں کھولنے کے لیے ناآموزوں اور ناتجربہ کاروں کو آگے بڑھایا جا رہا ہے جن کو صرف سن رسیدہ تجربہ کاروں ہی کے ناخن تدبیر کھول سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے لوگوں کے اس احساس آزردگی کی کوئی پروا نہیں کی کیونکہ وہ اس گر سے خوب واقف تھے کہ ذی صلاحیت نوجوانوں کے ابھرنے کے سب سے اچھے مواقع وہی ہوتے ہیں جب ان کو بڑوں کے بالمقابل یا ان کی موجودگی میں اپنے جوہر دکھانے کے لیے میدان میں لایا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو اس طرح کے مواقع بڑی فیاضی سے بہم پہنچائے اور جب انھوں نے محسوس کیا کہ بعض لوگ ان کی کم عمری کے سبب سے ان کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو انھوں نے بھری مجلس میں امتحان کرا کے یہ ثابت کر دیا کہ جس نوجوان کو وہ بوڑھوں کی مجلس میں جگہ دے رہے ہیں وہ فی الواقع اپنے علم و فضل اور اپنی فکر و نظر کے اعتبار سے اس جگہ کا اہل ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تمام علم اور فراست کی جڑ تو قرآن ہے اگر ایک شخص قرآن کا نکتہ داں ہے اور بڑے بوڑھوں پر اس پہلو سے ترجیح رکھتا ہے تو محض اس سبب سے امت اس کے فیوض سے کیوں محروم رہے کہ وہ چند سال اور پیچھے دنیا میں کیوں نہ آیا۔

بخاری شریف میں خود حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بعض اوقات مجھے ان اکابر کے ساتھ کسی مشورہ میں شرکت کے لیے بلا لیتے جو غزوہ بدر میں شریک رہنے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ یہ چیز ان میں سے بعض لوگوں کو ناگوار گذری تو انھوں نے اعتراض کیا کہ ہمارے

ساتھ انھیں کیوں بلا لیا جاتا ہے جب کہ ان کی عمر کے ہمارے بچے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ یہ جس خانوادہ علم و فضل سے تعلق رکھتے ہیں اس سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ بالآخر ایک دن انھوں نے سب لوگوں کو بلایا اور ساتھ ہی مجھے بھی بلا لیا۔ میں تاڑ گیا کہ آج مجھے اسی لیے یاد فرمایا گیا ہے کہ ان بزرگوں پر میری صلاحیتیں واضح کر دی جائیں۔ جب سب لوگ جمع ہو چکے تو حضرت عمرؓ نے سب کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ اذا جاء نصر اللہ والفتح میں کس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کچھ لوگ تو اس سوال پر خاموش رہے لیکن بعض لوگوں نے کہا کہ اس میں ہم کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت کا ظہور ہو تو ہمیں خدا کا شکر بجا لانا چاہیے اور اس سے مغفرت مانگنی چاہیے۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ابن عباسؓ تمہاری بھی یہی رائے ہے؟ میں نے عرض کی کہ نہیں یا امیر المومنین۔ بولے پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اس میں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کی طرف اشارہ ہے۔ فتح و نصرت کے ظہور کو آپ کی وفات علامت بتایا گیا ہے، اور اس کے ساتھ تسبیح اور استغفار کی ہدایت کی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ میں بھی وہی سمجھتا ہوں جو تم کہتے ہو (اتقان جلد ۲ ص ۱۸۶)

اس روایت سے متعدد اہم باتیں روشنی میں آتی ہیں:

پہلی چیز تو اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں فضیلت کا اصلی معیار اللہ کی کتاب کا علم ہے۔ جو شخص اس کتاب کے علم سے بہرہ مند ہے، وہ اس امت کے اندر ہر مشورہ میں شریک کیے جانے اور رائے دینے کا اہل ہے، کوئی اونچی سے اونچی مجلس بھی اتنی اونچی نہیں ہو سکتی کہ اس کے لیے قرآن کے اسرار و رموز سمجھنے والے کسی شخص کو ناموزوں قرار دیا جا سکے۔ مسلمانوں میں سب سے بڑا شرف ابتدائے اسلام میں غزوہ بدر کی شرکت کو خیال کیا جاتا تھا یہاں تک کہ جو لوگ اس میں شرکت کی سعادت سے محروم رہے تھے، وہ ان لوگوں سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے، جو اس میں شریک رہ چکے تھے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ ایک بالکل کم عمر نوجوان کو حضرت عمرؓ نے شرکائے بدر کے پہلو بہ پہلو بٹھا کے اس سے مشورے لیے اور جب انھوں نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت عمرؓ نے فہم قرآن میں اس کی نکتہ رسی کو نمایاں کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ نوجوان اپنے علم قرآن کے لحاظ سے اس بات کا حقدار ہے کہ کمسنی کے باوجود اکابر کے پہلو میں جگہ پائے اور لوگ اس سے مشورے پوچھیں۔

دوسری چیز اس سے جو نمایاں ہوتی ہے وہ حضرت عمرؓ کا طریقہ تربیت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے قرآن کا علم حضرت عمرؓ سے یا پھر حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے حاصل کیا ہے[1]۔ حضرت عمرؓ نے ان کو جس طرح قرآن کی تعلیم دی اس کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ ان کو سبقاً سبقاً قرآن پڑھایا ہو بلکہ وہ ان سے قرآن کی مشکلات سے متعلق صرف سوالات کرتے تھے اور اس طرح لائق شاگرد کو موقع دیتے تھے کہ وہ خود اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرے اور فہم قرآن میں جولانی دکھائے جو تمام علم کی کلید ہے۔

تیسری چیز جس کا اس واقعہ سے ثبوت ملتا ہے وہ حضرت عمرؓ کی بیدار مغزی اور اس امت کے لیے ان کی خیر خواہی ہے۔ وہ ایک حکمراں کی حیثیت سے جس طرح امت کے حاضر کی فکر رکھتے تھے اسی طرح اس کے مستقبل کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے اور مستقبل کے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز ان کے نزدیک ذی صلاحیت نوجوانوں کی تربیت تھی۔ انھوں نے اپنی عملی مثال سے ثابت کیا کہ قوم کے ذی صلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ایک ذمہ دار حکمران کا نہایت اہم وظیفہ ہے۔ انھوں نے صرف خود ہی اس فرض کا احساس نہیں کیا بلکہ قوم کے دوسرے لیڈروں کو بھی اس فرض کا احساس دلایا۔ حد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس احساس کے پیدا کرنے کے سلسلہ میں اگر ان کی ناخوشی کا خطرہ پیدا ہوا تو اس کی بھی انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔

حضرت عمرؓ کی طرف سے حضرت ابن عباسؓ کی حوصلہ افزائی کی مثالیں اس کے علاوہ اور بھی ملتی ہیں۔

بخاری ہی میں ایک دوسری روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے صحابہ کی ایک مجلس میں سوال کیا کہ آیت اَیَوَدُّ احدکم ان تکون لہ جنۃ من نخیل واعناب الآیۃ کس کے بارے میں وارد ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس جواب پر غصہ آگیا۔ فرمایا کہ کہیے کہ جانتے ہیں۔ یا کہیے کہ نہیں جانتے۔ ابن عباسؓ بولے کہ امیر المومنین میرے دل میں اس کے متعلق ایک بات آئی ہے۔ فرمایا بھتیجے تمہارے دل میں جو ہے وہ کہو، اپنے کو حقیر نہ سمجھو۔ ابن عباسؓ نے کہا یہ ایک شخص کے عمل کی مثال دی گئی ہے۔ پوچھا کس کے عمل کی؟

[1] تذکرۃ الحفاظ ذکر ابن عباس

ابن عباسؓ نے کہا ایک ایسے مالدار کے عمل کی جو برابر نیکی کرتا رہا لیکن پھر شیطان نے اس کو بہکایا اور وہ بدی میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے تمام نیک اعمال برباد ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت ابن عباسؓ اپنی کم عمری کے سبب سے بڑوں کی مجلس میں زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے تاہم وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ اپنے استاد اور اپنے امیر کے سامنے بھی اپنی رائے ظاہر نہ کریں۔ بالخصوص جب کہ اظہار رائے ہی کے لیے انھیں بلایا گیا ہو۔ اگر تقاضائے عمر وہ کچھ جھجک محسوس کرتے ہی تھے تو حضرت عمرؓ ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی یہ جھجک دور کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنی فکری تربیت کے ان قیمتی مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے رہے جو حضرت عمرؓ نے ان کو عنایت فرمائے۔

بعض مرتبہ حضرت عمرؓ صحابہؓ کی بھری مجلس میں ابن عباسؓ کی قرآن فہمی ان کی نکتہ رسی اور ان کی فصاحت و بلاغت کی تعریف اتنے شاندار الفاظ میں کرتے کہ ابن عباسؓ ہی کا ظرف تھا کہ وہ ان تمام تعریفوں کو ہضم کر سکے، کوئی معمولی ظرف کا آدمی ہوتا تو ان تعریفوں سے بہک جاتا لیکن حضرت عمرؓ اپنے شاگرد کے ظرف سے اچھی طرح واقف تھے۔

ابونعیم نے ایک روایت درج کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مہاجرین کی ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ لیلۃ القدر کا ذکر چلا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ حضرت ابن عباسؓ بھی مجلس ہی موجود تھے لیکن وہ خاموش بیٹھے رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا ابن عباسؓ! آپ کیوں چپ ہیں" آپ کچھ کیوں نہیں کہتے؟ کہیے، اپنی کم عمری کا خیال نہ کیجیے۔ اس کے بعد حضرت عباسؓ نے ایک مدلل اور نہایت فصیح و بلیغ تقریر فرمائی اور آخر میں اس تقریر کا خلاصہ یہ نکالا کہ ان کے نزدیک لیلۃ القدر رمضان کے آخری سات دنوں کے اندر ہے۔ حضرت عمرؓ ان کی اس تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تقریر سن کر فرمایا کہ اس معاملہ میں اس نوجوان کے سوا جس کے سر کی ہڈیاں بھی ابھی پوری نہیں بنی ہیں، میری بات تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکا" اس کے بعد مجمع کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ" اے حضرات! اس خوبی کے ساتھ اس بات کو میرے سامنے ابن عباسؓ کے سوا اور کون بیان کر سکتا ہے۔

ابن عمرؓ کا اطمینان اس کم عمری میں حضرت ابن عباسؓ کا بڑوں کے سامنے تفسیر قرآن میں کلام کرنا

بعض محتاط اور متورع صحابہ کو کھٹکتا تھا اور وہ اس کو ایک قسم کی جسارت پر محمول کرتے تھے۔ لیکن چونکہ پاکیزہ نیت لوگ تھے، معاصرانہ چشمک کی تنگ نظریاں ان کے اندر نہیں تھیں، اس وجہ سے تجربہ اور امتحان کے بعد یہ لوگ حضرت ابن عباسؓ کے علم و فضل کے قایل ہوتے چلے گئے۔ اس طرح کے لوگوں میں خاص طور پر قابل ذکر حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ یہ عمر میں حضرت ابن عباسؓ سے چند سال بڑے تھے اور علم و فضل اور خاص طور پر احتیاط اور تقویٰ میں ان کا جو مقام تھا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ دینی معاملات میں اپنی شدت احتیاط کے لیے یہ مشہور ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ احتیاط میں یہ تشدد کی حد تک بڑھ گئے تھے۔ اپنے اس تورع کے سبب سے وہ اس بات پر کچھ حیران سے ہوتے تھے کہ حضرت ابن عباسؓ قرآن کے معاملہ میں بڑے بڑوں کی مجالس میں بھی جرأت دکھا جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے ان سے سورہ انبیاء کی آیت ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما کی تاویل پوچھی۔ ابن عمر نے اس سے کہا کہ اس کی تاویل ابن عباسؓ سے جا کر پوچھو اور جو تاویل وہ بتائیں واپسی پر وہ مجھے بھی بتاتے جائیو۔ اس نے حضرت ابن عباسؓ سے جا کر اس کی تاویل پوچھی انھوں نے فرمایا کہ:-

"آسمان کے بند ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ پانی نہیں برساتا تھا اور زمین کے بند ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نباتات نہیں اگاتی تھی۔ خدا نے آسمان سے پانی برسا کر آسمان کو کھول دیا اور زمین سے نباتات اُگا کر زمین کو کھول دیا۔"

سائل نے ان کا یہ جواب واپس آ کر حضرت ابن عمرؓ کے پاس نقل کیا۔ یہ جواب جب انھوں نے سنا تو بولے "تفسیر قرآن کے معاملہ میں مجھے ابن عباسؓ کی جسارت کچھ اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس چیز کا ان کو خاص علم ملا ہے۔"

دوسروں کے اعترافات حضرت ابن عباسؓ نے ایک ایسے زمانہ میں جب کہ قرآن کے علم سے زیادہ کسی علم کی بھی لوگوں کی نگاہوں میں وقعت نہیں تھی اس علم میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ہر بڑا اور چھوٹا ان کے کمال کا مداح و معترف بن گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صاحب کمال کا اعتراف ان کے بارہ میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن عباسؓ اگر ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کی ہمسری کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔

مجاہد کہتے ہیں کہ جہاں تک فتووں کا تعلق ہے میں نے ابن عباسؓ سے بڑھ کر کسی کے فتوے نہیں دیکھے یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات پیش کر دے۔

طاؤس کہتے ہیں کہ میں پانچسو ایسے صحابہؓ سے واقف ہوں جنھوں نے جب کبھی بھی ابن عباسؓ سے کسی معاملہ میں بحث کی تو انھوں نے ان کو قایل کر کے چھوڑا۔

ابو وایل بتاتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں ایک مرتبہ ان کو امیر حج بنایا۔ انھوں نے خطبہ حج میں سورۂ نور کی تفسیر بیان کرنی شروع کی اور ایسی تفسیر بیان کی کہ اس سے پہلے میں نے کسی کی ایسی تفسیر نہ دیکھی نہ سُنی۔ اگر ایرانی اور رومی اور ترک بھی اس کو سنتے تو سُن کر مسلمان ہو جاتے۔

مشہور شاعر حُطیئہ کے متعلق نقل ہے کہ اس نے ایک نوجوان کو حضرت عمرؓ کی مجلس میں دیکھا کہ سب پر چھایا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا مجلس میں یہ کون ہے جو عمر میں تو سب سے نیچے ہے لیکن اپنے علم کے زور سے سب کو دبائے ہوئے ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ ابن عباسؓ ہیں۔ اس نے یہ سُنا تو فی البدیہہ ان کی شان میں چند شعر کہے۔

اسی طرح حسّانؓ بن ثابت کی طرف سے بھی ان کی شان میں اشعار منقول ہیں اور یہ اشعار ایسے عمدہ ہیں کہ ان کو یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اردو خوان حضرات ان کی خوبیوں اور بلاغتوں سے اچھی طرح محظوظ نہیں ہو سکیں گے۔ (باقی)

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

کر سکتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ ان کے قایل ہونے کا ہے۔ ان کا قایل ہونا منحصر ہے اس بات پر کہ جن لوگوں کی تعلیمی مہارتوں پر ان کو اعتماد ہے پہلے وہ قایل ہوں اور ان تعلیمی ماہروں کو قایل کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ جن لوگوں پر اس چیز کی ضرورت و اہمیت واضح ہے وہ ان کو قایل کرنے کے لیے کوئی جامع اسکیم بھی لائیں اور اس اسکیم کی افادیت واضح کرنے کے لیے دلائل بھی پیش کریں۔ یہ کام اس ملک کے تمام دینی درد مندوں کے مل کر کرنے کا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ کام نہ ہو سکا۔ اب بھی صحیح طریقہ کار یہی ہے اور ہم اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے ہر مسلمان سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر تمام گروہی اور جماعتی تعصبات سے بالاتر ہو کر غور کرے اور اس مقصد کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے

اس سے دریغ نہ کرے۔

مذکورہ بالا کوشش کے ساتھ ساتھ اس وقت یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسی تعلیمی و تربیتی مجلس قائم کی جائے جو فی الحال مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کرے:

۱۔ ایک ایسے کالج یا تربیتی ادارہ کا قیام جو عربی اور انگریزی دونوں تعلیموں کا جامع ہو اور جس کا اسٹاف جدید و قدیم دونوں علوم کے ماہرین اور دینی حمیت رکھنے والے فاضلین پر مشتمل ہو۔

۲۔ ایک دارالتصنیف کا قیام جو ان تمام مسایل پر جو اس وقت جدید فکر و فلسفہ اور اسلام کے تصادم سے پیدا ہو رہے ہیں، اعلیٰ پایہ کی کتابیں تیار کرے اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرے۔

۳۔ ایک مرکز اصلاح معاشرہ کا قیام جو معاشرہ کی گرتی ہوئی اخلاقی حالت کو سنبھالنے اور اس کی اصلاح کے لیے وہ تمام مناسب تدبیریں اختیار کرے جو اس وقت اختیار کی جا سکتی ہیں۔

ان کاموں کے لیے تین قسم کے لوگوں کا تعاون مطلوب ہے۔

سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ان لوگوں کا، جو اس مقصد کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی پوری محنت و کوشش صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔

دوسرے درجہ پر ایسے اصحاب علم کا، جو مذکورہ بالا کاموں میں سے جس کام کے لیے ذہنی و دماغی صلاحیتیں رکھتے ہیں، اس کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کرنے کے لیے آمادہ ہیں، عام اس سے کہ وہ قدیم تعلیم پائے ہوئے ہیں یا جدید۔

تیسرے مرتبہ میں ان لوگوں کا جو ان مقاصد کے لیے سرمایہ اور وسایل فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور ان پر اپنا سرمایہ خرچ کرنے اور ان کے لیے اپنے وسایل للہ فی اللہ استعمال کرنے پر آمادہ ہیں۔

اگرچہ یہ بظاہر تین مختلف قسم کے کام ہوں گے اور ان کے لیے افراد و اشخاص بھی تین مختلف قسم کے مطلوب ہوں گے لیکن ان تمام کاموں کی روح اور ان تمام افراد کا نصب العین ایک ہوگا۔ وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو خود بھی از سر نو استوار کریں اور دوسرے اللہ کے بندوں کو بھی اس کے استوار کرنے کی دعوت دیں۔ تعلیم و تربیت ہو یا تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ ہو یا اصلاح معاشرہ کی جد و جہد، ہر کام میں یہی روح جاری و ساری ہونی چاہیے۔